© rasailojaraid.com

محمد اسحاق بھٹی

# میاں عبدالعزیز مالواڈہ بار ایٹ لا

میاں عبدالعزیز مالواڈہ برصغیر پاک و ہند کی معروف شخصیت تھے۔ آئندہ صفحات میں ان کے حالات و سوانح بیان کیے جا رہے ہیں جو ان کی یادداشتوں یا ان کے صاحب زادے میاں عبدالمجید مرحوم اور ان کے پوتوں کے بیانات سے مرتب کیے گئے ہیں۔

میاں عبدالعزیز اپنے دور میں لاہور ہی کی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی نامور شخصیت تھے اور ان سے ملنے والے اور اُنھیں جاننے والے بہت سے لوگ اب بھی لاہور میں یا پاکستان کے دوسرے مقامات میں موجود ہیں، وہ نہایت احترام سے ان کا نام لیتے ہیں اور قانون دان حضرات بالخصوص بے حد تکریم سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اب ہم پہلے ان کے آبا و اجداد سے اور پھر خود ان سے آپ کو متعارف کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے قارئین میں سے اکثر حضرات کے لیے غالباً یہ بالکل نیا تعارف ہوگا۔

میاں عبدالعزیز کے دادا کا نام حاجی رحیم بخش تھا جو خاص شہر لاہور (اندرون دہلی دروازہ) کے رہنے والے تھے اور ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور اچھے خاصے زمیندار خاندان کے فرد تھے، موجودہ مصری شاہ کے علاقے کی تقریباً تمام زمین ان کی ملکیت تھی اور اس کے وہ خود ہی کاشت کار تھے۔ مصری شاہ کا رحیم روڈ انھی کے نام سے منسوب ہے۔

حاجی رحیم بخش کے ایک بیٹے کا نام الٰہی بخش تھا، جنھوں نے بعد میں مولوی الٰہی بخش کے نام سے شہرت پائی۔

مولوی الٰہی بخش میں ایک نمایاں صفت یہ تھی کہ بڑے نیک اور تقویٰ شعار تھے۔ دینوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کاموں کے ساتھ ساتھ دینی امور کی انجام دہی کا بھی اُنھیں بہت شوق تھا۔ ان کی صحت قابلِ رشک تھی ۔ قد چھ فٹ سے زیادہ تھا اور بڑے خوب صورت گراں ڈیل جوان تھے ۔

ان کا زمانہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ تھا جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کے عروج کا زمانہ تھا اور اس دور میں انگریزوں نے اس ملک کے باشندوں کو دائرہ عیسائیت میں داخل کرنے کے لیے عیسائی مشنریوں کا وسیع جال بچھا رکھا تھا۔ انگلستان یا دوسرے ملکوں سے یہاں پادری آتے اور آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ مسلمانوں کو وہ خاص طور سے اپنا ہدف بناتے تھے۔ کسی کو نوکری کا لالچ دے کر اور کسی کو کسی دوسرے طریقے سے مذہب سے دور ہٹانے کی سعی کرتے ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جتنے زیادہ لوگ عیسائی ہوں گے ، اسی نسبت سے اس ملک میں برطانوی اقتدار کی مخالفت کا زور ٹوٹے گا اور حکومت مستحکم ہوگی ۔ اس خیال کے پیش نظر اُنھوں نے عیسائی مبلغوں اور پادریوں کو ملک کے تمام شہروں اور دیہات و قصبات میں چاروں طرف پھیلا دیا تھا ۔ لاہور میں کئی پادری عیسائیت کی تبلیغ میں مشغول تھے ۔ ان میں ایک پادری کا نام "فورمین" تھا۔ وہ عیسائیت کا بہت بڑا مبلغ اور خوش بیان شخص تھا۔ صاف اردو بولتا تھا اور دور دراز سے لوگ اس کی تقریر سننے آتے تھے۔ دہلی دروازے کے باہر لنڈے بازار کے بالکل شروع میں وہ سٹیج لگا لیتا تھا اور ہر مذہب کے لوگ اس کی تقریر میں شریک ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ وہ مناظرے اور مباحثے بھی کیا کرتا تھا ۔

ان دنوں لاہور میں اس دور کے ایک مشہور عالمِ دین مولوی حافظ ولی اللہ سکونت پذیر تھے جو عیسائیت کے متعلق بہت معلومات رکھتے تھے ، اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے ۔ پادری فورمین سے ان کی بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا ۔ مولوی الٰہی بخش عام طور پر حافظ ولی اللہ کے ساتھ رہتے تھے اور نہایت غور اور شوق سے ان کی باتیں سنتے تھے ۔ حافظ صاحب کی معلومات اور حریف پر گرفت کا یہ عالم تھا کہ پادری فورمین سے اُنھوں نے جتنے مناظرے کیے ، سب میں کامیاب رہے ۔ ان کی شیریں بیانی سے لوگ بے حد متاثر ہوتے تھے ۔

اس قسم کی بحثیں اور باتیں سنتے سنتے الٰہی بخش دینی معاملات میں پختہ ہو گئے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



وہ سخت قسم کے موحّد اور غیر شرعی رسوم سے نفور تھے۔ غالباً حافظ ولی اللہ کے کہنے سے انھوں نے بھی دہلی جاکر میاں سیّد نذیر حسین صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل کیا تھا۔

مولوی الٰہی بخش کے حصولِ علم کا بھی ایک پس منظر ہے جو بڑا دلچسپ ہے۔ اوائل عمر میں ایک مرتبہ گواہ کی حیثیت سے وہ ایک عدالت میں پیش ہوئے، جج انگریز تھا اور غالباً اس کا نام ریٹی گن تھا، اور یہ وہی ریٹی گن تھا، جس کے نام کی ضلع کچہری کے بالکل قریب ایک سڑک "ریٹی گن روڈ" کے نام سے موسوم ہے۔ گواہی کے دوران ان کے مخالف وکیل اور خود جج صاحب نے مولوی الٰہی بخش پر طویل جرح کی، لیکن مولوی الٰہی بخش نے ان کی جرح کا بڑے تحمل سے مقابلہ کیا اور ہر سوال کا نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ مخالف وکیل اور جج صاحب نے کئی پہلوؤں سے جرح کی اور ان کو اِدھر اُدھر سے گھیر گھار کر اپنے نرغے میں لاتے اور مطلب کی بات اگلوانے کی کوشش کی، مگر وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جرح ختم ہوئی تو جج صاحب نے پوچھا:

نوجوان! کچھ پڑھے لکھے ہو۔؟

جواب دیا: نہ لکھ سکتا ہوں، نہ پڑھ سکتا ہوں۔

جج صاحب نے نہایت شفقت آمیز الفاظ میں کہا: بیٹا! کچھ پڑھ لو۔

ان کو پڑھنے لکھنے کا شوق تو پہلے ہی سے تھا، اب جج صاحب کے کہنے سے اس میں مزید اضافہ ہوگیا اور زمینداری کے ساتھ ساتھ پڑھائی لکھائی بھی شروع کر دی۔ عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی اور اس ماحول کے مطابق اردو میں مہارت پیدا کی۔ اب اس راہ میں آگے قدم بڑھائے تو پہلے مختاری کا امتحان پاس کیا، پھر وکالت کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور اس کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور وکالت شروع کر دی۔

ایک دفعہ ایک مقدمے میں اسی جج (ریٹی گن) صاحب کی عدالت میں بطور وکیل پیش ہوئے۔ جج صاحب نے ان کو پہچان لیا۔ مقدمہ اس خوش اسلوبی سے پیش کیا کہ جج صاحب نہایت متاثر ہوئے اور اپنے دو ایک ساتھیوں کو بلا کر پھر یہی کیس سُنا اور ان سے بھی سننے کی درخواست کی۔ مولوی الٰہی بخش نے دوسری مرتبہ پہلے سے اچھی طرح کیس پیش کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کیس سن چکے تو جج صاحب نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ لڑکا کچھ عرصہ پہلے گواہ کی حیثیت سے میری عدالت میں پیش ہوا تھا، اس وقت یہ اَن پڑھ تھا، آج وکیل بن چکا ہے اور جس عمدگی سے اس نے بحث کی ہے وہ آپ نے سن لی ہے۔

مولوی صاحب جو مقدمہ لیتے تھے، اس میں بے حد محنت کرتے تھے اور اس کے تمام گوشوں پر اچھی طرح غور کر کے عدالت میں جاتے تھے۔ کبھی کسی مقدمے میں بغیر تیاری کیے، وہ عدالت میں نہیں گئے۔ اسی محنت اور تیاری کا نتیجہ تھا کہ ان کی شہرت تھوڑے سے عرصے میں دور دور تک پھیل گئی تھی۔

اب ان کی وکالتی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے اور وہ لاہور سے ہوشیار پور میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر طویل عرصے تک اسی شہر کو اپنا مسکن قرار دیے رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر بعض لوگ انھیں مولوی الٰہی بخش ہوشیار پوری کہتے ہیں۔

۱۸۷۳ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں "گھوڑ باہ" میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تصادم ہو گیا، انگریزوں کی حکومت تھی، اس لیے مسلمانوں کے خلاف بہت سے فوجداری مقدمات قائم کر دیے گئے تھے اور بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ بعض مقدمات ضلعی حکام کی طرف سے دائر کیے گئے تھے اور بعض وہاں کے عیسائیوں کی طرف سے!

گھوڑ باہ کے زیادہ تر مسلمان ناخواندہ تھے، عیسائیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور روپیہ وغیرہ کا لالچ دے کر متعدد مسلمانوں کو عیسائی بنا لیا۔ جب بات پورے علاقے میں پھیل گئی اور وہاں کے تھوڑا بہت پڑھے لکھے اور قرب وجوار کے مسلمانوں کے علم میں آئی تو انھوں نے مداخلت کی اور نتیجتاً مسلمان اور عیسائی باہم متصادم ہو گئے۔ تصادم کا معاملہ پہلے پولیس میں گیا، اس کے بعد عدالت میں پہنچا۔

حکومت اور عیسائیوں کی طرف سے مقدمات دائر ہونے کی وجہ سے ہوشیار پور کا کوئی وکیل مسلمانوں کی پیروی کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ یوں بھی وہاں کوئی مسلمان وکیل نہ تھا اس صورت حال سے وہاں کے مسلمان سخت پریشان تھے۔ وہ وکیل کی تلاش میں لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچے۔ لاہور میں ان دنوں مولوی الٰہی بخش وکالت کرتے تھے، وہ مولوی صاحب سے ملے اور سارا قصہ بیان کیا۔ مولوی صاحب کو عیسائیوں کے عقائد کے بارے میں کافی معلومات حاصل تھیں، وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مناظرات و مباحثات سنتے بھی رہے تھے اور خود بھی ان سے مختلف مقامات پر مناظرے کر چکے تھے، اس لیے ان مقدمات کی پیروی کرنا ان کے لیے علمی اعتبار سے مشکل نہ تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کے ساتھ وہ ہوشیار پور پہنچے اور کافی عرصہ انھیں وہاں قیام کرنا پڑا۔ قیام کی تین وجوہ تھیں۔

ایک وجہ مقدمے کی پیروی اور تیاری کرنا تھی۔ مقدمہ نہایت اہمیت کا حامل تھا اور اس کی تیاری میں بڑی محنت کرنا پڑتی تھی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ وہاں کے مسلمان چاہتے تھے کہ مولوی صاحب زیادہ سے زیادہ عرصہ وہاں مقیم رہیں۔

تیسری وجہ خود مولوی صاحب کا تبلیغی جذبہ تھا جو اُنھیں مجبور کرتا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے اسلام کی صاف ستھری تعلیمات سے روشناس کرایا جائے اور ان کے دلوں میں اسلام کی حقانیت راسخ کی جائے۔

اس اثنا میں حالات نے ایسی کروٹ لی کہ وہ ہوشیار پور میں قیام پذیر ہو گئے اور وہیں وکالت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وکالت کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کی تبلیغ بھی کیا کرتے تھے، لوگوں کو قرآن و حدیث کا درس بھی دیتے تھے اور دیگر مذاہب سے اسلام جن معاملات میں ممتاز ہے، اس کی تفصیلات بھی بتاتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور ہندوستان (بالخصوص پنجاب) کے مختلف علاقوں اور شہروں سے علمائے کرام ان کے مکان پر تشریف لاتے اور قیام فرماتے تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوشیار پور شہر اور ضلعے میں دینی اور دنیوی اعتبار سے مسلمانوں میں بیداری کی ایک خوش گوار لہر دوڑ گئی جو آگے چل کر نظم و نسق کے بہترین سانچے میں ڈھل گئی۔

ہوشیار پور میں ان کی شہرت و ناموری کا اصل سبب "گھوڑ باہ" کا مقدمہ تھا جو انھوں نے نہایت جرأت و دلیری کے ساتھ لڑا اور جس میں اللہ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


ان کی شہرت و ناموری کی بنا پر ہندوؤں کے ساتھ ہمیشہ ان کا ٹکراؤ رہتا تھا اور یہ ہمیشہ ان کے مقابلے میں اللہ کے فضل سے کامیاب رہے۔

مولوی الٰہی بخش کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ لڑکوں میں ایک میاں عبدالعزیز تھے، جن کا ذکر آئندہ صفحات میں تفصیل سے آرہا ہے۔ دوسرے ڈاکٹر عبدالحفیظ تھے جو میاں عبدالعزیز سے آٹھ سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بڑا کام کیا اور اس سلسلے میں جرمنی، ترکی اور افغانستان وغیرہ ملکوں میں طویل عرصے تک مقیم رہے۔ آزادی سے پانچ مہینے پہلے ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو ترکی سے لاہور آئے، ۱۰ جولائی ۱۹۶۴ء کو وفات پائی اور اپنے آبائی قبرستان الٰہی بخش پارک مصری شاہ میں دفن کیے گئے۔ ان کی ولادت ۲ جولائی ۱۸۸۴ء کو ہوئی تھی۔

مولوی الٰہی بخش کے متعلق یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ۵ دسمبر ۱۸۹۱ء کو رات کی ٹرین سے ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور سے منٹگمری (ساہیوال) جا رہے تھے کہ راستے میں اوکاڑہ سے آگے ریل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا، جس میں مولوی صاحب کو سخت چوٹیں آئیں۔

حادثے کے تھوڑے دن بعد مولوی الٰہی بخش نے حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا، لیکن بیماری کی وجہ سے مقدمے کی پیروی وہ خود نہیں کر سکتے تھے، یہ فریضہ ان کے بیٹے میاں عبدالعزیز انجام دیتے رہے۔ ریلوے حکام نے اثنائے مقدمہ میں مولوی صاحب سے مجھوتے کی کوشش کی اور کہا کہ اگر وہ مقدمہ واپس لے لیں تو تیس ہزار (۳۰۰۰۰) روپے ان کی خدمت میں پیش کیے جائیں گے۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ حادثے میں تمام مرنے والوں اور زخمیوں کو اسی طرح رقم دی جائے تو وہ سمجھوتہ کرنے کو تیار ہیں، اگر ان کو رقم نہیں دی جاتی تو مجھوتے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہ مقدمہ انگریز ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں طویل عرصے تک چلتا رہا۔ بالآخر خارج کر دیا گیا۔ بعد ازاں مولوی صاحب نے چیف کورٹ میں اس کی اپیل دائر کی، اس اپیل کا فیصلہ ۱۸۹۵ء میں مولوی صاحب کے حق میں ہو گیا اور بیس ہزار روپے کی ڈگری ہوئی، لیکن خرچ بیس ہزار روپے سے بہت بڑھ گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ پہلا مقدمہ تھا جو کسی ہندوستانی نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کے خلاف دائر کیا تھا۔ اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے خلاف لوگوں کو بولنے کی جرأت ہوئی اور حکومت سے مطالبۂ حقوق کے جذبے نے کروٹ لی۔

مولوی الٰہی بخش وکیل کے بارے میں تین چار باتیں اور سنتے جائیے۔ اس سے ان کی شخصیت کے بعض پہلو مزید نکھر کر سامنے آئیں گے اور ان کی سماجی، قومی اور دینی تگ و تاز کے کئی ایسے گوشے نمایاں ہوں گے جو نظروں سے اوجھل ہیں۔

اُنھوں نے اپنے دور میں لاہور کی ارائیں برادری کو منظم کیا اور غمی شادی کے مواقع پر وہ جن غیر اسلامی رسوم کا ارتکاب کرتے تھے، ان سے روکا۔ ان کو دیکھ کر بعض دوسری برادریوں نے بھی ان رسوم کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ انجمن حمایتِ اسلام کے بانیوں میں سے تھے۔ انجمن کے لیے چندہ جمع کرنے کا طریقہ اس کے بانیوں نے یہ اختیار کیا تھا کہ ہر گھر میں مٹی کا گھڑا رکھ دیا گیا تھا۔ عورتیں آٹا گوندھتے وقت آٹے کی ایک مٹھی اس گھڑے میں ڈال دیتی تھیں۔ ہفتے کے بعد یہ آٹا انجمن حمایت اسلام کے دفتر پہنچا دیا جاتا تھا۔ آٹا جمع کرنے کے لیے پنجابی کا یہ سلوگن بنایا گیا تھا جو ہر محلے میں لوگ گاتے پھرتے تھے۔

"مٹھی آٹا پا صدقہ جان پیاری دا۔"

ایک وقت ایسا بھی تھا کہ انگریزی حکومت مسلمانوں کو فوج میں بھرتی نہیں کرتی تھی، اس لیے کہ مسلمان انگریز کے باغی تھے اور خطرہ تھا کہ یہ لوگ فوج میں بغاوت پھیلائیں گے۔ اس سلسلے میں مولوی الٰہی بخش کی قیادت میں سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد گورنر سے ملا اور درخواست کی کہ یہ فیصلہ واپس لیا جائے اور مسلمانوں کو آبادی کے تناسب کے مطابق فوج میں بھرتی کیا جائے۔

مولوی صاحب نے زوردار الفاظ اور موثر طریقے سے مسلمانوں کی نمائندگی کی اور حکومت سے مسلمان جن حقوق کے طالب تھے، ان کو واضح الفاظ میں بیان کیا، دورانِ گفتگو میں گورنر نے مولوی صاحب سے کہا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کیا آپ کے قرآن کا حکمِ جہاد منسوخ ہوگیا ہے؟

مولوی صاحب نے جواب میں فرمایا، کیا انگریز اس قدر پست ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کو اس کے خلاف جہاد کی ضرورت پڑ گئی ہے؟

گورنر صاحب یہ الفاظ سن کر خاموش ہوگئے اور مسلمانوں کو فوج میں ملازمتیں ملنے لگیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا ثناء اللہ صاحب کے اخبار "اہلِ حدیث" (امرتسر) میں مختلف تبلیغی و دینی معاملات سے متعلق مولوی الٰہی بخش کا ذکر ہوا ہے، انھیں "مولوی الٰہی بخش ہوشیارپوری" لکھا گیا ہے۔

مولوی الٰہی بخش ۱۹۱۹ء میں اپنے تمام اہلِ خانہ کے ساتھ ہوشیارپور سے لاہور آگئے تھے اور یکی دروازے کے باہر، ریلوے لائن کے ساتھ، ایک موریہ پُل کے قریب بٹ سرکلر روڈ پر سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کا گھر علما کا مسکن اور مختلف ذہن و فکر کے سیاست دانوں کا مرکز تھا۔

اس مردِ موحّد نے ۵۔جون ۱۹۲۰ء (رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ) کو لاہور میں وفات پائی اور مصری شاہ میں اپنے ذاتی قبرستان (الٰہی بخش پارک) میں جو انھی کے نام پر منسوب ہے دفن کیے گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا ان کے جانشین ہوئے بعد ان کو لاہور کی ارائیں برادری کا سربراہ بنایا گیا۔

میاں عبدالعزیز ۱۹۔ اگست ۱۸۷۲ء کو اپنے ننھیال امرتسر میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ والدہ وفات پاگئیں اور چھوٹی عمر ہی میں بیمار پڑ گئے، جس کی وجہ سے ڈاکٹروں کے مشورے سے تعلیم چھوڑ دینا پڑی۔

۱۸۸۹ء میں ہوشیارپور میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول (انجمن حمایت اسلام) لاہور میں داخلہ لیا جو حویلی دھیان سنگھ میں قائم تھا۔ ۱۸۹۲ء میں اس اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ [illegible] داخل ہوئے مگر خرابیٔ صحت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا ۔

ان دنوں سر میاں محمد شفیع اور میاں شاہ دین لاہور کے سر کردہ ارکان میں سے تھے اور دونوں بیرسٹر تھے ۔ ان کے مشورے سے مولوی الٰہی بخش نے میاں عبدالعزیز کو بیرسٹری پاس کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا ۔ وہ ۲۹۔ ستمبر ۱۸۹۵ء کو بمبئی سے انگلستان کو روانہ ہوئے ۔ ۱۴۔ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو وہ بحری جہاز سے انگلستان پہنچے اور ۷۔ نومبر ۱۸۹۵ء کو وہاں قانون کی مشہور درس گاہ لِنکنز ان میں داخلہ لیا ۔ مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) بھی اس وقت اس درس گاہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ مسٹر جناح اور میاں صاحب کی پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی جو آگے چل کر دوستی میں بدل گئی ۔

میاں عبدالعزیز ابتدا ہی سے انگریزوں کے خلاف تھے ۔ اس ضمن میں یہاں ایک خط کا حوالہ دینا ضروری ہے جو اُنھوں نے ستمبر ۱۸۹۶ء کو اپنے والدِ محترم مولوی الٰہی بخش کو انگلستان سے تحریر کیا تھا ۔ یہ خط اُنھوں نے اس رقم کے بارے میں لکھا تھا جو اُن کے والد انھیں بھیجا کرتے تھے ۔ یہ رقم اُنھیں دیر سے ملی تھی ۔ میاں صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں، جن میں مال و دولت کے باب میں انگریزوں کی نفسیات کا تجزیہ کیا گیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"یہ ملک ایسا ہے کہ اگر آپ کے پاس پیسہ ہو تو سب کچھ ہے اور اگر نہ ہو تو ایک منٹ میں سب کچھ ندارد ۔ خاص کر جب کہ ایسی طوطا چشم قوم انگریزوں سے واسطہ ہو ۔ یہ تو زر کے بندے ہیں ۔ بیوپاری لوگ ہیں ۔ پیسے کی ادائیگی میں ایک منٹ کی دیر ہو جائے تو سب کام بگڑ جاتا ہے ۔"

اسی خط میں مزید لکھتے ہیں ۔

"آج کل یہاں بڑے زور شور سے سلطان ترکی کے خلاف تقریریں ہو رہی ہیں ۔ زارِ روس اور ان کی بیوی پرسوں سے یہاں آئے ہوئے ہیں ۔ لارڈ سالسبری کل اس معاملے کے متعلق اُن سے گفتگو کے لیے بمقام بالٹی مور گئے تھے ۔ آج کل لڑائی کا خوب چرچا ہو رہا ہے ۔ اُدھر سلطان نے بھی حکم دے دیا ہے کہ کسی کا کوئی بیڑا ڈیڈ پول میں آئے تو فوراً اس کو توپوں سے اڑا دو ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


"دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ نہ معلوم ہندوستان کے مسلمان کن خیالات میں ہیں۔ وہ اس پولیٹیکل معاملے میں اگر کوئی حصہ نہیں لیتے تو انھیں اپنے اسلام کا پاس تو کرنا چاہیے، خواہ وہ سلطان کی مدد نہ ہی کریں، مگر جب کوئی عیسائی اسلام پر الزام لگائے تو مسلمانوں کو اس کا جواب تو ضرور دینا چاہیے۔

"پرسوں "پال مال گزٹ" میں جو یہاں کا اخبار ہے، ایک بے ایمان انگریز نے اپنی رائے دی تھی کہ اگر ہندوستان کے مسلمان ترکی کے معاملے میں کچھ حصہ لیں تو انھیں دبا دو۔ اس پر آج میرا کچھ لکھنے کا ارادہ ہے، اور لکھ کر اسی اخبار کو بھیجوں گا تاکہ اس کا جواب چھپ جائے۔

"افسوس ہمارے ہندوستان کے اخبارات اس معاملے پر کچھ زور شور سے نہیں لکھتے۔ خدا خیر کرے اور حالات بہتر ہوں۔ اگر لڑائی ہوئی تو دیکھیں گے، اکیلے انگریز کس طرح ترکی کا مقابلہ کرتے ہیں۔"

یہ خط بڑا طویل ہے اور بعض ان سیاسی معاملات سے متعلق اشارے اس میں آگئے ہیں جو اس دور میں بین الاقوامی حیثیت رکھتے تھے۔ اس خط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ میاں عبدالعزیز جوانی اور طالب علمی کے زمانے ہی میں ان مسائل سے کس قدر دلچسپی رکھتے تھے، مسلمانوں کی تکلیفوں کا انھیں کتنا احساس تھا اور انگریزوں کے خلاف ان کے جذبات کس درجہ تیز تھے۔

اس خط میں کسی مقدمے کے بارے میں بھی لکھا ہے، جس کا تعلق ہندوستان سے تھا، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مقدمے کی نوعیت کیا تھی۔ لکھتے ہیں۔

"ہاں اگر آپ مجھے اس مقدمے کا، جس کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا تھا، مفصل حال لکھ بھیجیں تو میں یہاں کے اخبارات میں کرسٹی اور چیٹرجی کی وہ مٹی پلید کروں جو وہ ہمیشہ یاد رکھیں۔"

"اگر جناب مناسب سمجھیں تو اس کا پورا حال مع ان کے بیانات کے، جن میں انھوں نے اختلاف کیا ہے، مجھے بھجوادیں۔ میں یہ سب کچھ یہاں کے اخبارات میں چھپوادوں گا۔ اس قسم کے مقدمات کے سلسلے میں اگر آپ کچھ چھپوانا چاہیں یا اس کے متعلق کوئی بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پارلیمنٹ میں پہنچانا چاہیں تو آپ مجھے لکھ دیا کریں، میں اس کا پورا بندوبست کر لیا کروں گا۔"

جس زمانے میں میاں عبدالعزیز انگلستان میں تعلیم حاصل کرتے تھے، اس زمانے میں مولوی الٰہی بخش کی مالی حالت بہت کمزور تھی، ریلوے کے حادثے کی وجہ سے وہ کافی عرصہ بستر علالت پر دراز رہے تھے اور آمدنی بہت کم رہ گئی تھی۔ گھر کے اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ ان کی وجہ سے وہ بیٹے کو ہر مہینے بڑی محدود رقم بھیجتے تھے۔ سعادت مند بیٹے کو باپ کی تمام مجبوریوں اور مالی پریشانیوں کا علم تھا۔ انھوں نے نہایت کفایت شعاری سے کام لیا اور انگلستان کی اعلیٰ تعلیم گاہ میں علم حاصل کرنے کے باوجود کم سے کم پیسے خرچ کرنے کی کوشش کی۔

وہ امتحانوں اور ڈنروں کی تمام منزلوں سے گزر کر ۲۲۔ جون ۱۸۹۸ء کو کال ٹو دی بار یعنی بیرسٹر ہوئے اور اس سے پانچ دن بعد، ۲۷ جون ۱۸۹۸ء کو بحری جہاز کے ذریعے انگلستان سے وطن روانہ ہوئے۔ ۱۷ جولائی ۱۸۹۸ء کو ان کا جہاز بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ وہاں سے انھوں نے اپنے والد محترم کو، جو اس وقت ہوشیارپور میں تھے، بمبئی پہنچنے کی اطلاع دی۔

بمبئی سے وہ بذریعہ ٹرین ہوشیارپور کو روانہ ہوئے۔ ان دنوں ریلوے لائن ہوشیارپور نہیں جاتی تھی، ہوشیارپور جانے والے لوگ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر اتر جاتے تھے اور وہاں سے مختلف سواریوں کے ذریعے ہوشیارپور جاتے تھے۔ ٹرین لدھیانے پہنچی تو دیکھا کہ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم ریلوے اسٹیشن پر جمع ہے۔ ان لوگوں میں ان کے والد مولوی الٰہی بخش بھی تھے، جن کا اُنھیں پتا نہیں تھا۔ اس ہجوم کو دیکھ کر میاں صاحب نے ایک شخص سے، جو پلیٹ فارم پر کھڑا تھا، پوچھا: یہ لوگ کیوں جمع ہوئے ہیں۔۔؟

اس نے بتایا کہ کوئی بیرسٹر صاحب لندن سے آرہے ہیں، ان کے استقبال کے لیے یہ لوگ یہاں آئے ہیں۔

بہر حال میاں صاحب کو لدھیانے ہی میں ٹرین سے اُتار لیا گیا اور وہ خواجہ احمد شاہ کی خواہش کے مطابق رات کو ان کے مکان پر رہے۔ دوسرے دن جالندھر پہنچے، جہاں ان کے دوست بھگت رام اور دیگر لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ ۲۳ جولائی ۱۸۹۸ء کو ہوشیارپور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


گئے، وہاں بے شمار لوگوں نے ان کو خوش آمدید کہا۔ چند روز ہوشیار پور قیام کرنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔

لاہور میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقاتیں کیں، وکالت کا لائسنس حاصل کیا اور قانون کی چند ضروری کتابیں خریدیں، پھر ہوشیار پور چلے گئے، جہاں ان کے والد بزرگوار اقامت گزیں تھے اور وکالت کرتے تھے۔ وہیں میاں عبدالعزیز نے اپنے والد کی نگرانی میں وکالت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

پہلا مقدمہ جو ان کے والد نے ان کو لے کر دیا، "مال پور" کا تھا اور ڈپٹی کمشنر مسٹر میکڈانلڈ کی عدالت میں تھا۔ میاں صاحب جب تاریخ مقررہ پر مال پور پہنچے تو وہاں تحصیل دار شہزادہ ہمدم سے ملے جو ان کو پہلے سے جانتے تھے۔ انھوں نے میاں صاحب سے آمد کی وجہ پوچھی تو انھوں نے اس مقدمے کا ذکر کیا، جس کے لیے وہ تشریف لائے تھے"۔

تحصیل دار شہزادہ ہمدم نے کہا، "اس مقدمے میں کوئی جان نہیں ہے۔ اس کی پیروی خود انھی کی عدالت میں ہو چکی ہے اور انھوں نے بڑی چھان بین کے بعد اس کا فیصلہ لکھا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس کا جو فیصلہ انھوں نے لکھ دیا ہے، کوئی عدالت اس کو بدل نہیں سکے گی۔

میاں صاحب یہ الفاظ سن کر مسکرا دیے اور تحصیل دار صاحب کو کوئی جواب نہیں دیا۔ مقدمہ شروع ہوا اور اس کی کارروائی کافی عرصہ جاری رہی۔ بالآخر فیصلہ ہوا، اور میاں صاحب کے قانونی نکات سے دو مجرم بری ہو گئے اور دو کی سزا کم ہو گئی۔

یہ پہلا مقدمہ تھا جو میاں صاحب نے لڑا اور جس میں انھیں اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ میاں صاحب کو بھی اس کامیابی پر بے حد خوشی ہوئی اور ان کے والد مکرم نے بھی بڑی مسرت محسوس کی۔ آگے چل کر انھوں نے قانون کے میدان میں بڑی شہرت پائی اور پورے ملک میں نامور ہوئے۔ وہ فوجداری مقدمات لیتے تھے اور یہی ان کا اصل میدان تھا۔ یہاں ان کے چند مقدمات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک سکھ نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا، پولیس کے تفتیشی مرحلے سے گزر کر کیس عدالت میں چلا گیا۔ میاں عبدالعزیز اس کے وکیل تھے۔ عدالت نے قاتل سے کہا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تمھیں یہ خطرہ نہ محسوس ہوا کہ بیوی کے قتل کے جرم میں پھانسی پر چڑھا دیے جاؤ گے ؟
سکھ نے جواب دیا ، مجھے یقین تھا کہ میاں عبدالعزیز مجھے پھانسی کے پھندے سے بچا لیں گے ۔

میاں صاحب نے اس کیس کی پیروی کی اور سکھ موت کی سزا سے بچ گیا ۔

اُس دور کے بہت سے سیاسی رہنماؤں کے خلاف انگریزی حکومت نے بہت سے مقدمات قائم کر دیے تھے ، جن میں سے بعض مقدمات نہایت خطرناک اور تشویش انگیز تھے ، میاں صاحب نے ان مقدمات کی بغیر فیس لیے پیروی کی اور وہ مقدمات جیتے ۔

۱۹۴۰ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے اس مشہور مقدمے کی پیروی بھی میاں صاحب نے کی تھی ، جس میں حکومت کے رپورٹر منشی لدھا رام نے شاہ جی کے خلاف گواہی دینے سے انکار کر دیا تھا اور حکومت کی طرف سے اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہو گئے تھے ۔

مولانا ظفر علی خاں کے ایک مقدمے کی پیروی میاں صاحب نے کی ، جب وہ رہا ہوئے تو انگریزی حکومت کے ڈر کی وجہ سے کوئی شخص ان کو اپنے گھر میں ٹھہرانے کو تیار نہ تھا ، خطرہ تھا کہ اس بنا پر وہ حکومت کے عتاب کی زد میں آ جائے گا ۔ میاں صاحب نے تقریباً دو مہینے ان کو اپنے گھر میں ٹھہرائے رکھا ۔

مشرقی پنجاب کے شہر روپڑ کا ایک کیس کسی زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا ۔ عید اضحیٰ کے دن قربانی کرنے پر ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں کئی ہندو مارے گئے تھے ۔ اس کیس کی پیروی میاں صاحب نے کی تھی ۔

مسجد شہید گنج کا کیس نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دُنیا میں شہرت پا گیا تھا اور اپنی نوعیت کا عجیب و غریب کیس تھا ، یہ کیس میاں عبدالعزیز نے کیا تھا ۔

انڈین نیشنل آرمی کے ( جسے آزاد ہند فوج کہا جاتا تھا ) جو باغی فوجی انگریزوں نے گرفتار کیے تھے ، ان میں سے بعض کے کیس کانگریس نے ، بعض کے مسلم لیگ نے کیے تھے ۔ مسلم لیگ کے حامی فوجیوں کے کیس میاں صاحب نے لڑے تھے اور یہ اتنے اہم کیس تھے کہ ان کی کارروائی تمام دُنیا کے اخباروں میں چھپتی اور ریڈیو میں نشر ہوتی تھی ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۹ مارچ ۱۹۴۰ء میں پنجاب حکومت نے خاکساروں پر گولی چلادی تھی، جس کے نتیجے میں بہت سے خاکسار جاں بحق ہو گئے تھے۔ یہ اس دور کا بہت بڑا واقعہ اور سانحہ تھا، خاکساروں کی حمایت میں یہ کیس میاں صاحب نے لڑا تھا۔

غازی علم الدین شہید کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس کیس کے سلسلے میں میاں صاحب نے مفید قانونی مشورے دیے اور اس ضمن کی تمام کارروائی میں حصّہ لیا۔

علاوہ ازیں اُنھوں نے مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد علی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حافظ محمد گوندلوی، خالد لطیف گابا، غازی محمود دھرم پال اور بہت سے علماء زعما اور سیاسی و مذہبی قائدین کے مقدموں کی پیروی کی اور ان سب میں اللہ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی۔

اخبار "مسلم آؤٹ لک" کے مالک و مدیر عبدالحق کے خلاف ۱۹۲۷ء میں حکومت نے جو مقدمہ قائم کیا تھا، اس میں میاں صاحب نے عبدالحق صاحب کی بڑی قانونی مدد کی تھی۔ پنجاب، صوبہ سرحد، یوپی، بہار، دہلی، غرض ہندوستان کے ہر صوبے کے لوگ کسی نہ کسی مقدمے کے سلسلے میں میاں صاحب کے پاس آتے تھے۔

میاں عبدالعزیز اور ان کے والد مولوی الٰہی بخش نے ہوشیار پور کے مسلمانوں کے لیے بڑی خدمات سرانجام دیں۔ ایک بہت بڑا کام اُنھوں نے یہ کیا کہ وہاں کے سرکردہ اور اصحابِ ثروت کو اسلامیہ سکول قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی اور اس کے لیے ایک تحریک شروع کر دی۔ اس سلسلے میں میاں عبدالعزیز نے ایک ہندو سے، جس نے ایک پرائیویٹ سکول قائم کر رکھا تھا رابطہ پیدا کیا اور وہ سکول اس سے خریدا، پھر اسے اسلامیہ مڈل سکول کے نام سے موسوم کیا۔ یہ پہلا اسلامیہ سکول تھا جو ہوشیار پور میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے۔

اس سکول کے قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں حصولِ علم کا جذبہ ابھرا اور تھوڑے سے ہی دنوں میں بہت سے مسلمان لڑکے سکول میں داخل ہو گئے۔ تین چار سال بعد اس مڈل سکول کو ہائی سکول کے درجے تک پہنچانے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس کے لیے نئے کمرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تعمیر کرنے کا منصوبہ زیرِ غور آیا۔

میاں صاحب نے اس اہم کام کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ شہر کے باہر "کمال پور" میں ایک قطعۂ اراضی خریدا گیا، جس میں ایک عالی شان عمارت کی تعمیر کا نقشہ بنایا گیا اور اس کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی سامنے آیا۔ سکول کے ساتھ ہی ایک وسیع جامع مسجد بنانے کا فیصلہ ہوا۔ اس سے کچھ فاصلے پر عیدگاہ کے لیے زمین خریدی گئی۔ یہ تمام اراضی ہوشیار پور جالندھر روڈ پر واقع تھی۔

اس کے لیے میاں صاحب نے اپنے رفقائے کار کی معیت میں مختلف مقامات کے دورے کیے اور چندہ جمع کیا۔ پھر ۲۳ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ہائی سکول کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ سنگ بنیاد علی گڑھ کے نواب مشتاق احمد (وقار الملک) نے رکھا تھا۔ اس موقعے پر ملک کی بہت سی مشہور شخصیات موجود تھیں، جن میں سر سید احمد خاں کے نبیرے آفتاب احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر کے داماد شعیب قریشی (جو قیام پاکستان سے کچھ عرصہ بعد پاکستان کے مرکزی وزیر بھی بنائے گئے تھے)، جسٹس میاں شاہ دین، میاں سر محمد شفیع اور علامہ اقبال خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں خان بہادر نواب سلیم اللہ خاں کی تجویز سے ڈھاکے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، اس میں میاں صاحب اپنی مصروفیتوں کی بنا شامل نہیں ہو سکے لیکن اس کے لیے انھوں نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے اگلے سال ۳۰ نومبر ۱۹۰۷ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی، جس کے صدر جسٹس میاں شاہ دین اور سیکرٹری سر میاں محمد شفیع بیرسٹر تھے۔ میاں عبدالعزیز اس اجلاس میں ہوشیار پور کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا تو میاں صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی تھی، اس لیے کہ اس کے ذریعے انگریزی حکومت نے اہل ہند پر شدید مظالم ڈھانا شروع کر دیے تھے اور جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) سے پہلے جو وعدے انھوں نے ہندوستانیوں سے کیے تھے، ان سے منحرف ہو گئے تھے۔ رولٹ ایکٹ کی مخالفت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


کے لیے ہندو، مسلمان اور سکھ سب متحد تھے، جس کے نتیجے میں بے شمار لوگوں کو جیل میں ڈال دیا گیا تھا اور بہت سے افراد کو گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا۔

میاں عبدالعزیز نے علاقائی اور ملکی سطح پر رولٹ ایکٹ کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور مختلف جلسوں میں اس کی مخالفت کی۔ اس ایکٹ کی رو سے حکومت جس کو چاہے اور جب چاہے کوئی وجہ بتلائے بغیر گرفتار کر سکتی تھی۔ نہ کسی عدالت میں اسے چیلنج کیا جا سکتا تھا اور نہ اس کے خلاف اپیل ہو سکتی تھی۔ میاں صاحب چونکہ قانون کے دائرے میں رہنے اور اس پر عمل کرنے کو ضروری قرار دیتے تھے، اس لیے رولٹ ایکٹ ان کے نزدیک انتہائی غیر پسندیدہ معاملہ تھا اور اس سے قانون کے تقاضوں پر زد پڑتی تھی، لہٰذا اس کو ختم کرانے کے لیے میدانِ عمل میں نکلنا میاں صاحب کے نزدیک لازمی تھا۔

اس زمانے میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی باہم متحد تھیں، ان سب کے اجلاس میاں صاحب کے مکان پر ہوتے تھے، یعنی ہوشیارپور میں میاں صاحب کا مکان سیاست دانوں اور انگریز کے مخالفوں کا مرکز تھا۔

ہوشیارپور میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہاں کی میونسپل کمیٹی کے انتخابات میں ہمیشہ ان کے ہم خیال اور انگریز کے مخالف (مسلمان اور غیر مسلم) کامیاب ہوتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں میاں صاحب نے وہاں جا کر وکالت شروع کی تھی اور پہلی دفعہ ۱۹۰۰ء میں وہاں کی میونسپل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے تھے، ۱۹۱۹ء تک (اکیس بائیس سال) وہاں رہے، اس اثنا میں وہ کمیٹی کے ہر انتخاب میں کامیاب ہوئے۔

لاہور میں وہ اس وقت آئے تھے، جب یہاں ہائی کورٹ قائم ہوا تھا۔ ہوشیارپور کے لوگوں نے جن میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی سب شامل تھے، وفود کی صورت میں میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ وہ ہوشیارپور میں رہیں اور لاہور نہ جائیں، مگر میاں صاحب یہاں آنے پر مجبور تھے، انھوں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں لاہور میں رہ کر آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا اور جب آپ آواز دیں گے، حاضر ہو جاؤں گا۔

میاں صاحب کے قیام ہوشیارپور کے زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ سنتے جائیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


ایک مرتبہ علامہ اقبال بھی ہوشیارپور تشریف لے گئے تھے اور نظام حیدر آباد کے شاعر مولانا غلام قادر گرامی بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے ادیب و شاعر اور معززین میاں صاحب کے مکان پر جمع تھے۔ رات کو شعر و شاعری کا دور چلا اور خوب محفل جمی۔ صبح کی اذان ہونے لگی تو مجلس برخاست ہوئی۔

دوسرے دن رات کو پھر وہی سلسلہ شروع ہوا اور محفل آراستہ ہو گئی۔ ہوشیارپور اور گردونواح کی بہت سی اہم شخصیتیں شریکِ محفل تھیں۔ ان میں ایک پیر صاحب بھی تھے، جن کے بہت سے مُرید تھے۔ ان کے ایک مُرید نے پیر صاحب کو دیکھا تو وہ وہاں آ گیا۔ اس نے حاضرینِ مجلس سے درخواست کی کہ میں پچاس روپے کا مقروض ہوں، میرے لیے دُعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے قرض سے نجات دلائے۔ پچاس روپے اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ اس نے درخواست کے ساتھ پانچ روپے اپنے پیر کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیے۔ اب لوگوں نے اللہ کے حضور ہاتھ اُٹھا کر اس کے لیے دُعا مانگنا شروع کی، لیکن علامہ اقبال نے دُعا کے لیے ہاتھ نہیں اُٹھائے، بلکہ اس انداز سے بیٹھے گئے کہ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ دُعا نہیں مانگ رہے ہیں۔

دُعا ختم ہوئی تو پیر صاحب نے علامہ اقبال سے سوال کیا: آپ دُعا کے قائل نہیں؟

"دعا کا قائل ہوں۔" علامہ نے جواب دیا۔

"اگر قائل ہیں تو دُعا کیوں نہیں کی؟" پیر صاحب نے پوچھا۔

جواب دیا، "دُعا کی درخواست کرنے والا آپ کی دُعا سے پچپن روپے کا مقروض ہو گیا ہے، جب کہ دُعا سے پہلے پچاس روپے کا مقروض تھا۔ میں ایسی دُعا میں شامل ہو کر اس کو مزید قرض میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور پیر صاحب خاموش ہو گئے۔

میاں صاحب کو لاہور میں وکالت شروع کیے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ (امرتسر) میں اس وقت کے گورنر پنجاب سر مائیکل اڈوائر کے زمانے میں نہتے لوگوں پر گولی چلا دی گئی تھی، گولی چلانے کا حکم دینے والے جنرل کا نام ڈائر تھا۔ اس میں بے شمار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوگئے تھے۔ سر مائیکل ایڈوائر ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک پنجاب کا گورنر رہا۔ ڈائر اور ایڈوائر دونوں ظالم اور ہندوستانیوں کے دشمن تھے۔

اس حادثے کے بعد اہلِ ہند کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی تھی اور وہ اس کی مخالفت میں متحد ہوگئے تھے۔ لیکن مائیکل ایڈوائر بھی سخت غصّے میں تھا اور انگریزی حکومت کے مخالفوں کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یہ حادثہ اس قدر اندوہناک تھا کہ نہ صرف اہلِ ہند بلکہ پوری دُنیا کے انصاف پسند لوگ اس سے متاثر ہوئے اور انگریزوں کے متعلق ان کے جذبات بھڑک اُٹھے۔

وہ عجیب و غریب زمانہ تھا۔ ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، حکیم محمد اجمل خاں، مولانا شوکت علی، محمد علی جوہر وغیرہ بہت سے بڑے بڑے لیڈر لاہور آئے تاکہ اس المیے کے خلاف احتجاج کیا جائے، مگر ایڈوائر نے اس قدر دہشت پھیلا رکھی تھی کہ ان لیڈروں کو کوئی شخص اپنے گھر میں ٹھہرانے پر تیار نہ تھا۔ ایک میاں عبدالعزیز تھے، جنھوں نے انگریز کے مخالف رہنماؤں کے لیے اپنی کوٹھی (جو یکّی دروازہ کے باہر سرکلر روڈ پر واقع تھی) وقف کردی تھی۔ اس کوٹھی کو لاہور میں انگریزی حکومت کے مخالف لوگوں کے ہیڈکوارٹر کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس میں دن رات ان کی میٹنگیں ہوتی تھیں اور ہر طبقہ و خیال کے لوگ ان سے آکر ملاقاتیں کرتے تھے۔ قیام و طعام وغیرہ ہر چیز کا وہاں وسیع انتظام تھا، جو جب چاہے آئے اور جب چاہے جائے۔ اس موقع پر ایک ہندوستانی لیڈر نے کہا تھا کہ لاہور میں میاں عبدالعزیز کا گھر ہندوستان کے اربابِ سیاست کے لیے فقط پناہ گاہ ہی نہیں بلکہ یہاں قیام و طعام کا سلسلہ بھی چلتا ہے ——— اس کے الفاظ تھے:

**Boarding and lodging Free**

۱۹۲۰ء میں لاہور کی میونسپل کمیٹی کے انتخابات ہوئے تو میاں صاحب نے ان میں حصّہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ ان لوگوں کو بھی انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں کامیاب کرایا جو ان کے ہم خیال اور حکومت کے مخالف تھے۔ اسی اثنا میں میاں صاحب کو کمیٹی کا سینئر وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں کمیٹی کا صدر انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتا تھا۔ میاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



صاحب واضح اکثریت سے وائس پریذیڈنٹ چُنے گئے تو ڈپٹی کمشنر نے کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کرنا چھوڑ دی تھی۔ میاں صاحب ہی صدارت کرتے تھے، ان کی صدارت میں انگریزی حکومت کے خلاف کمیٹی میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں جو سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔

ہائی کورٹ کے باہر، مال روڈ سے ملحق ایک تکونی باغ میں لارڈ لارنس کا بت نصب تھا۔ اس بت کے ایک ہاتھ میں قلم تھا اور ایک میں تلوار تھی۔ نیچے انگریزی میں یہ الفاظ درج تھے

**You want to be ruled by pen or sword**

یعنی "تم تلوار کی حکومت چاہتے ہو یا قلم کی"۔

یہ الفاظ ہندوستانیوں بالخصوص اہلِ پنجاب کی غیرت کے لیے زبردست چیلنج تھے۔ میاں صاحب نے ان توہین آمیز الفاظ کی بنا پر کمیٹی کے اجلاس میں اس بت کو اکھڑوا دینے کی قرارداد منظور کرائی۔

انگریزی حکومت نے اس قرارداد کی مخالفت کی، جس کی وجہ سے شہر میں ہنگامے ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انگریز نے یہ موقف اختیار کیا کہ بُت گورنمنٹ کی ملکیت ہے، اس لیے کمیٹی کو اس کے اکھڑوانے یا کسی دوسری جگہ منتقل کرانے کا حق حاصل نہیں ہے۔

میاں صاحب ان دنوں کمیٹی کے صدر تھے، اُنھوں نے کمیٹی کے ریکارڈ سے ثابت کیا کہ یہ بت جس شخص نے بنایا تھا، اس نے کمیٹی کو دے دیا تھا اور کمیٹی نے ہی اسے ہائی کورٹ کے باہر نصب کیا تھا، اس لیے یہ بت کمیٹی کی ملکیت ہے۔ کمیٹی اس کو نصب بھی کر سکتی ہے اور اکھڑوا بھی سکتی ہے۔

حکومت میاں صاحب کے دلائل کے مقابلے میں بے بس ہو گئی تو اس نے مصالحت کی کوشش کی اور جو الفاظ اس بت پر مرقوم تھے، ان کو بدلنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ الفاظ بدل دیے گئے تو معاملہ ختم ہو گیا۔

اب یہ بت لاہور کے عجائب گھر میں اوندھے مُنہ پڑا ہے۔

۱۹۲۳ء میں شہنشاہ برطانیہ جارج پنجم کے فرزند پرنس آف ویلز ولی عہد کی حیثیت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندوستان کے دورے پر آئے۔ ان کو خوش آمدید کہنے اور ان کی آمد پر مسرت کا اظہار کرنے کے لیے ملک کے بہت سے اداروں اور انجمنوں نے قرار دادیں منظور کیں اور جشن منانے کے پروگرام ترتیب دیے۔ چوہدری شہاب الدین اس وقت لاہور کی میونسپل کمیٹی کے نامزد رکن تھے، انھوں نے کمیٹی کی طرف سے ان کے خیر مقدم کا ریزولیوشن پاس کرانے کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی، لیکن میاں عبدالعزیز نے اس کی سخت مخالفت کی اور جلیانوالہ باغ کے حادثے کی بنا پر اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا، جس میں وہ کامیاب رہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ ریزولیوشن پاس ہونے میں رکاوٹ بنے بلکہ کمیٹی کی طرف سے پرنس آف ویلز کی آمد پر بائیکاٹ کا ریزولیوشن پاس کرا دیا۔ بائیکاٹ کے ریزولیوشن پر سرکاری حلقوں میں شدید ردِ عمل ہوا اور انگریزی حکومت کے وقار کو سخت دھچکا لگا۔

لاہور کا ڈپٹی کمشنر اس زمانے میں کرنل ٹیرر تھا۔ اس نے اس مسئلے کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور پرنس آف ویلز کے متعلق جو قرارداد منظور ہوئی تھی، اسے منسوخ کرانے کے لیے سخت جدوجہد کی۔ کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا، بیمار ارکان کو سٹریچروں پر ڈال کر لایا گیا اور بہت سے ارکان کو مختلف قسم کے لالچ دے کر ہم نوا بنایا گیا۔ اتنی بھاگ دوڑ اور کوشش کے بعد اسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ بائیکاٹ کے الفاظ واپس لے لیے گئے۔ اجلاس کی صدارت خود ڈپٹی کمشنر نے کی تھی اور ان الفاظ کے واپس لینے کی قرارداد بھی ان کے اپنے کاسٹنگ ووٹ سے پاس ہوئی تھی ـــ میاں عبدالعزیز اور اُن کے ساتھیوں کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ کمیٹی کی طرف سے ولی عہد کے استقبال میں کسی نے کوئی حصہ نہیں لیا، یعنی عملاً بائیکاٹ ہی رہا۔

لارڈ لارنس کے بت کو اکھڑوانے اور ولی عہد کے استقبال میں حصہ نہ لینے سے متعلق دو بہت بڑے فیصلے تھے جو میاں عبدالعزیز کی کوشش سے لاہور میونسپل کمیٹی نے کیے، سیاسی اعتبار سے ان فیصلوں کے دُور رس نتائج نکلے اور اس سے میاں عبدالعزیز اور اُن کے رفقائے کار کے اثر و رسوخ کے دائرے بہت وسیع ہوئے۔

۱۹۲۳ء میں پنجاب اسمبلی (جسے اس زمانے میں پنجاب کونسل کہا جاتا تھا) کے انتخابات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کا اعلان ہوا تو میاں صاحب نے لاہور سے انتخاب میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس موقعے پر بعض لوگوں نے علامہ اقبال کو بھی اسی سیٹ سے انتخاب لڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، مگر انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے اور میاں عبدالعزیز کے دیرینہ تعلقات ہیں اور وہ انتخابات میں حصّہ لے رہے ہیں، میں ان کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتا، چنانچہ علامہ نے انتخاب میں حصّہ نہیں لیا اور میاں صاحب کامیاب ہوئے۔

پنجاب کونسل کے انتخابات سے ایک سال قبل ۱۹۲۲ء کو لاہور میں شاہ عالم گیٹ کے باہر سرکلر روڈ پر ہندوؤں نے مندر اور مسلمانوں نے چھوٹی سی مسجد بنانے کا ارادہ کیا، جس پر کافی جھگڑے کی سی صورت پیدا ہوگئی۔ مسلمان میاں عبدالعزیز سے ملے اور ان سے مشورہ کیا۔ میاں صاحب نے کہا اگر ایک رات میں مسجد تعمیر کر لی جائے تو وہ حکومت کو سنبھال لیں گے یعنی مسجد گرانے نہیں دیں گے۔ چنانچہ میاں صاحب کے مشورے کے بعد مسلمانوں نے ایک ہی رات میں مسجد تعمیر کر دی اور صبح کی اذان اور نماز باجماعت اس مسجد میں ہوئی۔

ہندوؤں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے اور مسجد میاں صاحب کی کوشش سے منظور ہوگئی۔ بعد میں چندہ جمع کر کے مسلمانوں نے یہ مسجد دوبارہ تعمیر کی جو آج تک موجود ہے اور بے شمار لوگ اس میں نماز پڑھتے ہیں۔ اسی مسجد کی تعمیر پر علامہ اقبال نے یہ شعر کہا تھا۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

بہرحال اس مسجد کے بننے اور قائم رہنے میں میاں عبدالعزیز نے بنیادی کردار ادا کیا۔

۱۹۲۴ء میں لاہور میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور نہایت المناک صورتِ حال پیدا ہوگئی، میاں صاحب تمام فرقوں کے سرکردہ لوگوں سے ملے اور شہر میں امن کی فضا بحال کرنے کی کوشش کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



پنجاب میں سکھوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں بے شمار مسجدوں پر قبضہ کر لیا تھا، ان مسجدوں میں لاہور کی بادشاہی مسجد، سنہری مسجد، موتی مسجد، دائی انگاں والی مسجد، مائی لاڈو والی مسجد، مسجد نیلہ گنبد، مسجد شاہ چراغ اور مسجد شہید گنج شامل ہیں۔ انگریزی حکومت کے دور میں یہ مسجدیں آہستہ آہستہ مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ ۱۹۲۵ء میں مسلمانوں نے انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ مسجد شاہ چراغ بھی مسلمانوں کی تحویل میں دے دی جائے۔ اس کے لیے میاں صاحب نے بڑی تگ و دو کی، لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا حادثہ پیش آیا تو لوگوں کا ذہن مسجد شاہ چراغ کی طرف منتقل ہوا، چنانچہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ مسجد مسلمانوں کے لیے واگزار کر دی گئی۔ اس میں میاں عبدالعزیز کی مساعی کو بڑا دخل ہے۔

۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے دوبارہ انتخاب ہونے والے تھے کہ ایک دن علامہ اقبال اور میاں صاحب کی ملاقات میں انتخاب کے متعلق بات چیت ہوئی، جس میں میاں صاحب نے محسوس کیا کہ اس مرتبہ علامہ خود انتخاب کے میدان میں آنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میاں صاحب نے اسی وقت ان کے حق میں دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں کے باہم بہت اچھے مراسم تھے اور ایک دوسرے کے خیالات سے خوب آگاہ تھے۔

اب علامہ اقبال کے مقابلے میں ملک محمد دین کھڑے ہو گئے جو بیرسٹر تھے اور ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ میاں صاحب نے ملک صاحب سے بہت کہا کہ وہ علامہ کا مقابلہ نہ کریں، مگر وہ نہیں مانے اور مقابلہ کرنے پر مُصر رہے۔ میاں صاحب ارائیں برادری کے صدر تھے، اُنھوں نے اپنی برادری سمیت ملک محمد دین کی کھل کر مخالفت کی اور علامہ اقبال کی پوری حمایت کی اور جلسوں میں ان کے حق میں تقریریں کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک محمد دین ہار گئے اور علامہ اقبال ان کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے۔

اس سے اگلا الیکشن آیا تو علامہ اقبال نے الیکشن لڑنے سے انکار کر دیا اور میاں عبدالعزیز نے الیکشن لڑا۔ اب ملک محمد دین پھر میدان میں تھے اور میاں عبدالعزیز کا مقابلہ کر رہے تھے۔ حکومت کے حامی لوگ ملک صاحب کی حمایت اور میاں صاحب کی مخالفت میں تھے۔ لیکن میاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب کامیاب ہوئے اور اُنھوں نے ملک صاحب سے ۴۵۶۷ ووٹ زیادہ حاصل کیے۔

۱۹۲۵ء میں لاہور کے ایک ناشر کتب راجپال نے "رنگیلا رسول" کے نام سے ایک کتاب شائع کی، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور اسلام کے بارے میں نہایت غیر مہذب اور رکیک الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔

کتاب کا نام بھی انتہائی گستاخانہ تھا۔ اس سے مسلمانوں کو بے حد تکلیف پہنچی اور اُنھوں نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ جلسے ہوئے اور قرار دادیں منظور کی گئیں۔ میاں صاحب نے پنجاب اسمبلی میں وہ اخبارات پیش کیے جن میں احتجاجی جلسوں کی کارروائیاں اور ان میں منظور شدہ قرار دادیں شائع ہوئی تھیں۔

لاہور کی ایک عدالت میں راجپال کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا جو کچھ عرصے تک جاری رہا، عدالت کی طرف سے راجپال کو سزا ہو گئی۔ اس نے سزا کے خلاف سیشن عدالت میں اپیل کی، وہاں بھی سزا بحال رہی۔ جب اپیل ہائی کورٹ میں گئی تو عیسائی جج دلیپ سنگھ نے اس بنا پر راجپال کو بری کر دیا کہ انگریز کے مروّجہ قانون میں مذہبی اکابر کے خلاف کچھ کہنا یا لکھنا قابلِ سزا جرم نہیں ہے۔

اس فیصلے کا مسلمانوں پر اتنا سخت ردِ عمل ہوا کہ وہ اشتعال میں آ گئے اور عوامی جلسے جلوسوں اور اخباری مضمونوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ لاہور کے سرکردہ مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد گورنر صاحب سے ملا۔ اس وفد میں میاں عبدالعزیز بھی شامل تھے۔ گورنر نے ارکانِ وفد کو تھوڑی بہت تسلّی دی، اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ احتجاج اور مظاہروں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

اس اثنا میں یہ ہوا کہ لاہور کے ایک نوجوان علم الدین نے، جس کو اللہ نے بعد میں غازی علم الدین شہید کے نام سے شہرت عطا فرمائی، راجپال کو، اس کی دکان کے اندر جا کر قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۹۔اپریل ۱۹۲۹ء کو رونما ہوا۔

علم الدین کو گرفتار کر لیا گیا اور اس پر قتل کا مقدمہ چلا۔ مقدمے کی پیروی کے لیے میاں عبدالعزیز نے اپنی خدمات پیش کیں، لیکن مقدمہ سر میاں محمد شفیع بیرسٹر نے لڑا۔ علم الدین کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ اپیل کے لیے قائدِ اعظم محمد علی جناح سے رابطہ پیدا کیا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



انھوں نے مقدمے کی پیروی کی مگر فیصلے میں پھانسی کی سزا بحال رہی۔

۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میانوالی جیل میں غازی علم الدین کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی وصیت کے برعکس ان کو جیل ہی میں دفن کر دیا گیا۔ اس پر پورے پنجاب بالخصوص لاہور میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور مطالبہ ہونے لگا کہ غازی علم الدین شہید کی میت لاہور لائی جائے اور یہیں انھیں دفن کیا جائے۔

میاں عبدالعزیز نے اس سلسلے میں گورنر سے ملاقات کی اور کہا کہ انگریزی حکومت اپنے قانون کی رو سے پھانسی تو دے سکتی ہے مگر لاش اپنے قبضے میں نہیں کر سکتی۔ لاش اسے بہرحال وارثوں کے حوالے کرنا پڑے گی۔

گورنر نے جواب دیا: شہر میں فساد کا خطرہ ہے، اس لیے لاش یہاں نہیں لائی جا سکتی۔

میاں صاحب نے کہا: کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ لاش نہیں دیں گے تو فساد نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں لاش نہ دینے کی صورت میں فساد کا خطرہ ہے۔

بہرحال اس ملاقات میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ادھر حکومت کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کا سلسلہ لمحہ بہ لمحہ شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔

۸۔ نومبر ۱۹۲۹ء کو گورنر سے پھر ایک وفد نے ملاقات کی۔ یہ وفد علامہ اقبال، میاں عبدالعزیز، سر میاں محمد شفیع، خلیفہ شجاع الدین اور خواجہ دل محمد پر مشتمل تھا۔ اس ملاقات میں میاں عبدالعزیز نے گورنر سے پہلی ملاقات کا بھی ذکر کیا اور اپنے پہلے موقف کو دہرایا کہ اگر علم الدین کی لاش مسلمانوں کو نہ دی گئی تو حالات اس درجہ خراب ہو جائیں گے کہ ان پر قابو پانا ممکن نہیں ہوگا اور اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی۔

کافی دیر کی گفتگو کے بعد گورنر نے وفد کی بات مان لی اور ان حضرات کی یقین دہانی کے بعد کہ کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی، شہید کی لاش مسلمانوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب ارکان وفد نے مسلمانوں کی مشہور اور ممتاز شخصیتوں کو جمع کیا اور انھیں جنازے میں شریک ہونے [illegible] ہنگامہ نہ ہونے پائے۔ اگر خدانخواستہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو گیا تو انگریزی حکومت کو مسلمانوں کے خلاف کوئی نئی حکمتِ عملی اپنانے کا بہانہ مل جائے گا۔

آدھی رات کو یونیورسٹی گراؤنڈ کے قریب رائفل رینج میں غازی علم الدین شہید کی لاش میاں عبدالعزیز، علامہ اقبال اور سر میاں محمد شفیع کے حوالے کی گئی۔ شہر میں جنازے کا اعلان کر دیا گیا اور شام کے وقت نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ جنازے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے گورنر پنجاب سر مونٹ موریسی موقعے پر آئے اور میاں عبدالعزیز سے سوال کیا:

آپ کے خیال میں کتنے لوگ جنازے میں شامل ہوں گے؟

میاں صاحب نے جواب دیا: اتنے لوگ شامل ہوں گے کہ زمین نظر نہیں آئے گی۔

گورنر نے کہا: نہیں، نہیں۔ اتنے زیادہ لوگ نہیں آ سکتے۔

جوں جوں جنازے کا وقت قریب آ رہا تھا ہر طرف سے لوگ ہجوم در ہجوم چلے آ رہے تھے۔ تمام شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے تو فساد کے ڈر سے دکانیں بند کر رکھی تھیں، لیکن مسلمانوں نے شہید کے جنازے میں شرکت اور افسوس کی وجہ سے کاروبار بند کر دیا تھا۔ یہ لاہور کی تاریخ کا اتنا بڑا جنازہ تھا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ کئی لاکھ آدمیوں نے غازی علم الدین شہید کو دُنیا سے رخصت کیا۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ غازی علم الدین شہید کا کیس خود میاں صاحب لڑنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ علم الدین اگر قتل کا اقرار کر لے تو میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ اسے پھانسی کی سزا نہیں ہو گی۔ خود علم الدین بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اقبالِ جرم کر لے اور عدالت میں واضح الفاظ میں قتل کا اقرار کرے، لیکن بعض بڑے بڑے قانون دانوں کو اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ وہ قتل سے انکار کر دے۔

بہرحال یہ بہت بڑا مسئلہ تھا جو اس وقت لاہور میں پیش آیا۔ میاں عبدالعزیز نے اس ضمن میں بڑی خدمات سرانجام دیں اور بہت بھاگ دوڑ کی۔

شہید کا جنازہ پڑھنے کے لیے لوگوں نے جوتے اتارے تو جنازے کے بعد انسانوں کا جو بے پناہ ریلا آیا اس کی وجہ سے وہ پاؤں میں جوتے نہیں پہن سکے اسی طرح ننگے پاؤں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



قبرستان میانی صاحب کی طرف دوڑ پڑے، جہاں شہید کو دفن کرنے کے لیے قبر تیار کی گئی تھی۔ دوسرے دن لوگوں نے جا کر اپنے اپنے جوتے تلاش کیے۔

۱۹۲۷ء میں لاہور میں ہندو مسلم فساد ہوگیا، جس میں ایک مسلمان مارا گیا اور دس ہندو مارے گئے۔ شہر میں ہڑتال ہوگئی اور حکومت کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہڑتال ختم نہ ہوئی۔ آخر ایک دن شہر کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے گورنر صاحب باہر نکلے۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے سرکردہ لوگوں نے ان سے کہا کہ اگر میاں عبدالعزیز یہ ذمہ داری قبول کر لیں کہ کوئی فریق کسی فریق کے خلاف کوئی مضرت رساں حرکت نہیں کرے گا تو ہڑتال ختم ہو سکتی ہے، گورنر نے میاں صاحب سے رابطہ پیدا کیا اور میاں صاحب کی کوششوں سے ہڑتال ختم ہوگئی۔

اس پہ انگریز گورنر نے اپنی حکومت سے میاں صاحب کے لیے "سر" کا خطاب دینے کی سفارش کی، لیکن میاں صاحب نے خطاب لینے سے انکار کر دیا۔ پھر سپیشل اعزازی سند دینا چاہی، وہ بھی نہیں لی اور کہا کہ میں نے انگریزی حکومت کا کوئی کام نہیں کیا، میں نے اپنے طور پہ لوگوں کا کام کیا ہے، میں اپنے وطن کا خدمت گزار ہوں، انگریزوں کا نہیں۔

اس فساد کے موقعے پر ایک لطیفہ بھی ہوا۔ ایک ہندو نے اپنے ایک مسلمان دوست سے کہا کہ ہم نے ایک آدمی مارا تھا، مگر مسلمانوں نے ایک دو نہیں، اکٹھے ہمارے دس آدمی مار دیے۔

جواب میں مسلمان نے کہا: مسلمانوں کو حساب نہیں آتا، اس لیے ایسا ہو گیا ہے۔

۱۹۲۷ء کے بعد ۱۹۳۱ء اور پھر ۱۹۳۵ء میں بھی فسادات ہوئے، تو اس موقعے پر بھی میاں عبدالعزیز نے مسلمانوں کی بہت مدد کی۔

اس سے قبل ۱۹۲۶ء میں راولپنڈی میں ہندو مسلم فساد ہوا تو راولپنڈی کی انجمن اسلامیہ نے میاں صاحب کو وہاں کے حالات سے مطلع کیا، وہ وہاں گئے اور مسلمانوں کی مدد کی۔ ان دنوں جن حضرات نے لاہور سے راولپنڈی جا کر مسلمانوں کو تسلّی دی اور ان کی امداد کے لیے کوشاں ہوئے وہ تھے، میاں عبدالعزیز، ڈاکٹر محمد عالم، مولوی غلام محی الدّین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


اور سیّد محسن شاہ ۔ ۲۶ ۔ ستمبر ۱۹۳۶ء کو راولپنڈی کی انجمن اسلامیہ نے ایک قرارداد کے ذریعے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا ۔

۳ ر فروری ۱۹۲۸ء کو سائمن کمیشن دہلی پہنچا ۔ یہ کمیشن انگلستان سے آیا تھا جس کے قائد سرجان سائمن تھے ، اس لیے اسے "سائمن کمیشن" کہا جاتا تھا ۔ ہندوستان کی آزادی خواہ جماعتوں نے اس کے بائی کاٹ کا فیصلہ کیا تھا ، جب کہ وائسرائے ہند اور دیگر حکام کا اصرار تھا کہ اس کمیشن کا شان دار طریقے سے استقبال کیا جائے ۔ ۳۰ ۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو یہ کمیشن لاہور ریلوے اسٹیشن پر اُترا تو ایک جلوس کالی جھنڈیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے دہلی دروازے سے لنڈے بازار کے راستے ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھا ۔ جلوس میں ہندو بھی شامل تھے اور مسلمان بھی ۔ بڑے بڑے لیڈروں میں مولانا ظفر علی خاں ، مولانا عبدالقادر قصوری ، مولانا داؤد غزنوی اور لالہ لاجپت رائے کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ پولیس نے جلوس پر زبردست لاٹھی چارج کیا ، جس سے لالہ لاجپت رائے کو سخت چوٹیں آئیں اور انھی چوٹوں کی وجہ سے وہ انتقال کر گئے ۔ میاں عبدالعزیز سائمن کمیشن کے مخالفوں میں تھے ۔

آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا ایک اجلاس ۲۵ ۔ نومبر ۱۹۳۳ء کو امرتسر میں خان بہادر رحیم بخش (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج) کے مکان پر ہوا ، اس وقت کشمیر کے حالات بہت بگڑ چکے تھے ، ان پر غور کرنے کے لیے اس اجلاس میں علامہ اقبال ، ملک برکت علی ، مولانا سید داؤد غزنوی ، شیخ عبداللہ ، میر واعظ محمد یوسف اور سیّد محسن شاہ نے شرکت کی ۔ اور بھی بہت سے سرکردہ حضرات شریک اجلاس تھے ۔ اس ضمن میں میاں عبدالعزیز نے نہایت مفید مشورے دیے ۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں ہندو مسلم کشمکش نے شدت اختیار کی تو بہت سے مسلمان مالیر کوٹلہ سے لاہور آ گئے تھے ۔ یہاں کے مسلمانوں کی طرف سے ان کے قیام اور خوراک وغیرہ کا انتظام مجلسِ اتحادِ ملّت نے کیا تھا ۔ میاں عبدالعزیز نے اپنے طور پر ان لوگوں کی بہت مدد کی ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سر سکندر حیات خاں جب پنجاب کے وزیراعظم تھے، پنجاب اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ریونیو پر معمولی سا ٹیکس عائد کر دیا جائے اور اس آمدنی سے (لاہور کی) بادشاہی مسجد کی مرمت کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس کے لیے سات ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ میاں عبدالعزیز نے (اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے) اس تجویز کی پُرزور حمایت کی مگر سات رکنی کمیٹی کی سخت مخالفت کی، اس لیے کہ اس کے زیادہ ارکان سرکاری ملازم تھے اور ایک دیا دو کے سوا سب غیر مسلم تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کی جگہ مسلمان عہدے دار اس کمیٹی کے رکن مقرر کیے گئے اور یہ تجویز منظور ہوگئی۔ پھر انہی دنوں اس فنڈ سے بادشاہی مسجد کی مرمت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی وجہ سے سر سکندر حیات خاں کو بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے قریب (شمال مشرق میں) دفن کیا گیا۔

۲۰ جولائی ۱۹۳۵ء کو مسجد شہید گنج کی تحریک کے سلسلے میں مسلمانوں پر گولی چلی۔ اس کے چھ دن بعد ۲۶ جولائی کو بادشاہی مسجد میں مسلمانوں کا ایک اجلاس ہوا، جس کی صدارت میر مقبول محمود نے کی، اس موقعے پر مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔

مولانا ظفر علی خاں، سید حبیب، علامہ اقبال، میاں فیروز الدین احمد، خواجہ غلام مصطفیٰ، ملک لال خاں، میاں جلال الدین، خلیفہ شجاع الدین، شیخ محمد صادق، میاں امیر الدین، میاں عبدالعزیز، ڈاکٹر دلاور شاہ، میاں محمد اکبر، ملک محمد عمر خاں، خان بہادر ملک زمان مہدی خاں، میر مقبول احمد۔

مسجد شہید گنج کے بارے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ۱۷۴۵ء (۴۶-۱۱۴۵ھ) میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس پر سکھوں کا قبضہ ہوا تو مسلمانوں نے ۱۸۵۳ء میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا، ۱۸۵۸ء میں اس کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوگیا۔

۱۹۲۹ء میں انجمن اسلامیہ پنجاب کی طرف سے حصولِ مسجد کے لیے کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔

۱۹۳۵ء میں پھر کوشش ہوئی، جس میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان بہت حد تک ہم آہنگی پیدا ہوگئی [illegible] اُبھر آئے تھے۔ اس موقعے پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سکھوں کی طرف سے قیمت کا مطالبہ بھی ہوا ، مگر ابھی رقم کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ پھر اختلاف پیدا ہو گیا ۔

اس اثنا میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میاں عبدالعزیز نے اپنی طرف سے سکھوں کو پیش کش کی کہ وہ مسجد شہید گنج مسلمانوں کو دے دیں اور اس کے بدلے میں مصری شاہ میں دو گنا یا چار گنا یا جتنی زمین چاہیں ان سے لے لیں ۔

اسی دوران میں مسلمانوں کا ایک وفد اس سلسلے میں پنجاب کے گورنر ایمرسن سے ملا ، اس وفد کے قائد میاں عبدالعزیز تھے ، میاں صاحب نے گورنر کو مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں ۔

۱ ۔ دفعہ ۴۴ لگا کر مسجد کو حکومت اپنی تحویل میں لے لے ۔

۲ ۔ دوسرے آثارِ قدیمہ کی طرح یہ مسجد بھی محکمہ آثارِ قدیمہ کے سپرد کر دی جائے ۔

۳ ۔ مسلمانوں سے مسجد کی قیمت وصول کر کے سکھوں کو دے دی جائے اور مسجد کا قبضہ مسلمانوں کو دے دیا جائے ۔

تیسری تجویز پر گورنر نے میاں صاحب سے کہا ، اگر سکھوں نے مسجد کی بہت زیادہ قیمت کا مطالبہ کیا تو پھر کیا ہو گا ؟

میاں صاحب نے جواب دیا : میں اپنی کوٹھی (واقع بیرون یکی دروازہ) سکھوں کو دینے پر تیار ہوں اور اسی وقت اس کا قبضہ دے دیتا ہوں ، اس کوٹھی کی مالیت کئی لاکھ روپے کی ہے ۔ اس میں جو سامان پڑا ہے ، وہ بھی لاکھوں روپے کا ہے ، لیکن یہ بھی ان کو دے دیتا ہوں ۔ اس گفتگو کے وقت سکھ حضرات بھی موجود تھے ۔

اس پر گورنر صاحب لاجواب ہو گئے اور یہ وعدہ کیا کہ مسجد کو فی الحال اسی حالت میں رہنے دیا جائے گا ، جس حالت میں یہ اس وقت ہے ۔ سکھوں نے بھی اسی وقت یہ بات مان لی کہ جب تک دونوں فریق (سکھ اور مسلمان) کسی آخری نتیجے تک نہیں پہنچ جاتے ، مسجد موجودہ حالت میں رہے گی ۔

اس کے بعد سکھوں کے ایک وفد نے گورنر سے علیحدگی میں بات چیت کی تو گورنر نے ان سے کہا : یہ عمارت سالہا سال سے تمہارے قبضے میں ہے اب تم جو جی چاہے کرو ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سکھوں کو حکومت کی حمایت حاصل تھی، اس لیے اُنھوں نے مسجد کو شہید کر دیا۔ مسلمانوں کی جدوجہد پُر امن تھی، اُنھیں اس بات سے نہایت دُکھ ہوا۔ مسلمانوں نے اس حادثے کے خلاف پُر امن طریقے سے جلوس نکالنے کی کوشش کی، لیکن حکومت نے وہ تمام راستے بند کر دیے جو لنڈا بازار یا مسجد شہید گنج کی طرف جاتے تھے اور مسلمانوں کے جلوس پر گولی چلانے کا حکم دیا، چنانچہ اندھا دھند گولی چلنے لگی، جس سے بے شمار مسلمان شہید ہو گئے۔

میاں عبدالعزیز کا مکان بالکل قریب تھا اور وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے گورنر سے ٹیلی فون پر بات کی اور کہا آپ کی فوج نہتے مسلمانوں پر اس طرح گولیاں چلا رہی ہے، جیسے شکاری مرغابیوں پر چلاتا ہے۔ میاں صاحب کے الفاظ تھے:

**Duck Shooting**

اور ساتھ ہی ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ کوتوالی ان کے مکان کے قریب تھی، وہاں سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جانے کے لیے دو پاس آ گئے، ایک میاں صاحب کے لیے اور ایک ان کے ڈرائیور کے لیے۔ گورنر سے طویل ملاقات ہوئی اور کافی بحث مباحثے کے بعد گولی بند ہو گئی۔

اس کے بعد ایک انکوائری کمیٹی بنی، جس کے لیے میاں صاحب نے تمام واقعات جمع کیے اور بتایا کہ کتنے مسلمان شہید اور کتنے زخمی ہوئے ہیں۔ غرض مسجد شہید گنج کی تحریک کے زمانے میں میاں صاحب نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔

میاں عبدالعزیز کے حالات کے سلسلے میں یہ واقعہ بیان کرنا بھی شاید ضروری ہے کہ ۱۹۲۹ء کے آخر میں لاہور میونسپل کمیٹی کے صدر خان بہادر ملک محمد حسین نے صدارت سے استعفا دے دیا تھا، جس کی وجہ سے ۲۱ جنوری ۱۹۳۰ء کو نئے الیکشن ہوئے، اس اجلاس کی صدارت لالہ سندر داس نے کی جو کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ تھے۔ آئندہ صدارت کے لیے خواجہ دل محمد نے میاں عبدالعزیز کا نام پیش کیا، دوسرے ممبروں نے تائید کی اور میاں صاحب اتفاق رائے سے بلامقابلہ صدر منتخب ہوگئے۔ احرار کے حامی ممبر میاں صاحب کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



صدارت پر خوش نہیں تھے، لیکن انھوں نے اس لیے مقابلہ نہیں کیا کہ ان کا کامیاب ہوتا ممکن نہ تھا۔

ہندو مہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر گوکل چند نارنگ تھے، جو اس زمانے میں پنجاب کے وزیر بلدیات تھے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ لاہور میونسپل کمیٹی کا صدر ایک مرتبہ مسلمان اور ایک مرتبہ ہندو ہونا چاہیے، لیکن میاں صاحب نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز منظور نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر گوکل چند نارنگ جب اس چال میں ناکام ہو گئے تو انھوں نے وزیر بلدیات کی حیثیت سے لاہور میونسپل کمیٹی کے معاملات کی چھان بین کے لیے انگریز ایڈیشنل کمشنر ڈالبسن کی رہنمائی میں ایک سہ رکنی کمیشن مقرر کر دیا۔ اس کمیشن کے ایک رکن سر ظفر علی اور دوسرے سر دیا کشن لال تھے۔ تیسرے رکن خود مسٹر ڈالبسن تھے۔ اس کمیشن کا مقصد میاں صاحب کو بدنام کرنا تھا، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میاں صاحب نے کمیشن کے مختلف سوالات کا جو تفصیلی جواب دیا وہ ۳۰۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں میونسپل کمشنروں کے خطوط بھی شامل تھے۔ میاں صاحب کی یہ رپورٹ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۳۱ء میں میونسپل کمیٹی کے دوبارہ الیکشن ہوئے، جس میں میاں صاحب کامیاب ہوئے اور بھاری اکثریت سے کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہو گئے، لیکن چونکہ وہ حکومت کے مخالف تھے، اس لیے حکومت نے ان کا نام گزٹ کرنے سے انکار کر دیا۔ سر سکندر حیات ان دنوں قائم مقام گورنر تھے، انھوں نے ڈالبسن رپورٹ کو فائل کر دیا اور پھر میاں صاحب کا نام گزٹ ہو گیا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وزیر بلدیات گوکل چند نارنگ تھے جو میاں صاحب کے شدید مخالف تھے، میاں صاحب "لوکل سیلف گورنمنٹ" کو "گوکل سیلف گورنمنٹ" کہا کرتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں بمبئی سے قائداعظم محمد علی جناح نے میاں عبدالعزیز کو خط لکھا کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کو منظم کرنا چاہتے ہیں، اس سلسلے میں وہ لاہور میں سر کردہ لوگوں سے ملاقات کے خواہاں ہیں اور کہا کہ ملاقات ان کے مکان پر ہو گی۔ میاں صاحب نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور انھیں تشریف لانے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ لاہور آئے اور ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء کو میاں صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کے مکان پر اجلاس ہوا، جس میں قائد اعظم کے علاوہ علامہ اقبال، خان لیاقت علی خاں، ملک برکت علی، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول بیرسٹر اور بعض دیگر حضرات نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کو منظم اور اس کی تشکیل نو کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور پنجاب مسلم لیگ کے نئے عہدے دار منتخب کیے گئے۔

اس اجلاس میں ایک پارلیمانی بورڈ بھی بنایا گیا تھا، جو ۵۶ ارکان پر مشتمل تھا، ان ارکان میں علامہ اقبال، شیخ حسام الدین، مولانا عبدالقادر قصوری، چوہدری افضل حق، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین اور میاں عبدالعزیز شامل تھے۔

۱۹۳۷ء میں میاں عبدالعزیز مسلم لیگ کی طرف سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، مسلم لیگ کے دوسرے رکن اسمبلی ملک برکت علی تھے۔ انتخابات کے بعد پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہوئی، مگر یہ دونوں ۱۹۴۵ء کے انتخابات تک مسلم لیگ ہی میں شامل رہے۔

میاں عبدالعزیز بڑے خوش مزاج تھے۔ اس سلسلے میں دو لطیفے بیان کیے جاتے ہیں جن کا تعلق اسمبلی سے ہے۔

۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت کے ایک وزیر سر سُندر سنگھ مجیٹھیا فوت ہوئے تو پنجاب اسمبلی میں افسوس کی قرارداد پیش کی گئی، جس پر بہت سے ممبروں نے تقریریں کیں اور مرنے والے وزیر کے کارنامے بیان کیے۔ میاں عبدالعزیز نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تین چار منٹ کی نہایت مختصر تقریر میں انتہائی دلچسپ انداز میں فرمایا کہ پنجاب اسمبلی پانچ دریاؤں کے اندر کی اسمبلی ہے، مگر اس کے تمام وزیر باہر کے ہیں، میاں عبدالحیؒ اور سردار دسوندھا سنگھ باہر کے ہیں، سردار خضر حیات نہ الاالذی نہ الاالذی، یعنی نہ ادھر کے نہ اُدھر کے۔ صرف سر سُندر سنگھ مجیٹھیا تھے جو امرتسر کے تھے، ان کی وفات کے بعد اب "پنج آب" کا کوئی وزیر پنجاب اسمبلی میں نہیں رہا، اس لیے ہمیں ان کی موت کا سخت افسوس ہے۔

اس نکتے پر ہال میں قہقہے بلند ہوئے اور دیر تک لوگ ہنستے اور تالیاں بجا بجا کر میاں صاحب کو داد دیتے رہے۔

میاں صاحب نے یونینسٹ وزارت کو اے۔بی۔سی وزارت کا نام دیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



"اے" سے مراد ایبٹ تھے جو وزیر اعظم پنجاب کے انگریز سیکریٹری تھے۔

"بی" سے مراد بلدیو سنگھ تھے جو وزیر ترقیات تھے۔

"سی" سے مراد چوہدری چھوٹو رام تھے جو وزیر مال تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رو سے صوبائی وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم کہا جاتا تھا۔

میاں صاحب کے بے شمار واقعات ہیں جو ذہن میں آ رہے ہیں۔

۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو خاکساروں پر گولی چلائی گئی تھی، جس سے بہت سے خاکسار مارے گئے اور بہت سے شدید زخمی ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جو حسب ذیل چار حضرات پر مشتمل تھی۔

(۱) میاں عبدالعزیز چیئرمین (۲) مولانا سید داؤد غزنوی ممبر (۳) خالد لطیف گابا ممبر (۴) سید حبیب ممبر۔

خاکساروں کے وہ تمام مقدمات جو پولیس اور خاکساروں کے درمیان جھگڑے کے متعلق قائم کیے گئے تھے، میاں صاحب نے لڑے تھے اور قانونی نوعیت کی تمام کارروائی میں اُنھوں نے خاکساروں کی مدد کی تھی۔ اُنھوں نے یہ ثابت کیا کہ پولیس نے نہتے مسلمانوں کا بے دریغ قتلِ عام کیا اور لوگوں کے گھروں کے اندر گھس کر گولیاں چلائیں۔ میاں صاحب کمیشن کے ارکان کو اپنے ساتھ موقع پر لے کر گئے اور مکانوں کے اندر دیواروں پر گولیوں کے نشان دکھائے۔

دوسری جنگ عظیم (ستمبر ۱۹۳۹ء تا ستمبر ۱۹۴۵ء) کے دوران آزاد ہند فوج قائم کی گئی تھی جسے آئی، این، اے (انڈین نیشنل آرمی) کہا جاتا تھا۔ یہ فوج درحقیقت سبھاش چندر بوس اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے معرضِ قیام میں آئی تھی اور اس کا تعلق اسی فوج سے تھا جس کا کام انگریزی حکومت کی مدد کرنا تھا۔ اس میں مسلمان، ہندو اور سکھ سبھی شامل تھے۔ جب نازی (یعنی جرمن، اٹلی اور جاپان) جنگ ہار گئے اور اتحادی (یعنی برطانیہ، فرانس، امریکہ، روس اور چین) جیت گئے تو انڈین نیشنل آرمی والوں کو گرفتار کر کے ہندوستان لایا گیا اور انگریزی حکومت نے ان کے خلاف بغاوت کے مقدمے قائم کیے۔ ان میں سے بعض فوجیوں کے کیس کانگرس نے اور بعض کے مسلم لیگ نے لڑے۔ مسلم لیگ کی طرف سے ان کی پیروی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



میاں عبدالعزیز کے سپرد کی گئی تھی۔ میاں صاحب نے نہایت محنت سے اس ذمے داری کو نبا ہا، یہ کارروائی ۱۹۴۶ء میں شروع ہوئی تھی جو قیام پاکستان تک جاری رہی۔ آزادی کے بعد خود بخود ختم ہوگئی۔

۱۹۴۵ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میاں عبدالعزیز نے لاہور کے حلقہ سول لائن سے اور میاں امیرالدین نے اندرون شہر سے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن دونوں کے کاغذات نامزدگی مسترد ہوگئے تھے۔ میاں محمد رفیق اور مہر وزیر محمد ان سیٹوں پر آزاد حیثیت سے انتخاب لڑ رہے تھے۔ میاں عبدالعزیز نے اپنے بھانجے میاں عبدالسمیع کو، اپنے بیٹے میاں عبدالمجید کو اور ایک شخص مبارک دین کو میاں محمد رفیق اور مہر وزیر محمد کے پاس بھیجا کہ یہ دونوں مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیں تو انھیں مسلم لیگ کا ٹکٹ دے دیا جائے گا، مقصد یہ تھا کہ لاہور کی یہ دونوں سیٹیں مسلم لیگ کے نام پر جیتی جائیں، چنانچہ اُنھوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا اور کامیاب ہوگئے۔

کاغذات نامزدگی مسترد ہونے کے بعد میاں عبدالعزیز نے الیکشن پٹیشن داخل کر دی تھی، وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کے کاغذات نامزدگی اس لیے مسترد کیے گئے ہیں کہ مسلم لیگ کا نمائندہ لاہور سے کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سے مسلم لیگ کو سیاسی طور پر نقصان پہنچانا اور کمزور کرنا مقصود تھا۔ پٹیشن کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ پاکستان بن گیا اور یہ معاملہ ختم ہوگیا۔

میاں عبدالعزیز اور علامہ اقبال کی کوشش سے ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ لاہور میں مسلم انشورنس کمپنی قائم ہوئی۔ یہ کمپنی جھنگ اور خانیوال میں بھی قائم کی گئی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے حصے بہت زیادہ تھے۔

علامہ اقبال کی ایک مشہور اور طویل نظم "شکوہ" ہے جو "بانگ درا" میں ہے۔ علامہ نے یہ نظم لکھی مگر اس کا عنوان قائم نہیں کیا گیا تھا۔ عنوان کے متعلق ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ ہائی کورٹ کے بار روم میں ان کی ملاقات میاں عبدالعزیز سے ہوئی۔ اُنھوں نے پڑھنے کے لیے یہ نظم میاں صاحب کو دی اور پوچھا کہ اس کا عنوان کیا ہونا چاہیے۔ میاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


صاحب نے نظم پڑھ کر ان سے کہا آپ نے شکوہ کیا ہے۔ علامہ نے اسی وقت اس کا عنوان " شکوہ " لکھ دیا۔

میاں صاحب کے نام مختلف مقامات سے روزانہ بے شمار خطوط آتے تھے۔ تقریباً پینتیس ۳۵۰۰۰ ہزار خطوط ان کے پوتے میاں عبدالمعید اور میاں عبدالوحید کے پاس موجود ہیں جو ملک اور بیرونِ ملک کی مشہور و ممتاز شخصیتوں نے ان کو تحریر کیے۔ ان خطوط کی حیثیت دورِ گزشتہ کے ہندوستان کی بہت بڑی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ کی ہے۔ میرے خیال میں پوری دُنیا میں یہ واحد مثال ہے کہ کسی ایک شخص کے نام اس قدر کثیر تعداد میں خطوط محفوظ ہیں۔ ان خطوط کے حصول کے لیے دُنیا کے معروف اداروں کے نمائندوں نے میاں عبدالمعید سے رابطہ پیدا کیا مثلاً انڈیا آفس لائبریری (لندن) اور بعض دیگر ملکی و غیر ملکی لائبریریوں کے نمائندے ان سے ملے اور لاکھوں ڈالروں اور پونڈوں میں سودا کرنے کی کوشش کی مگر وہ یہ نہایت اہم ذخیرہ کسی کے حوالے کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔

ان خطوط میں ہندوستان کی ایک مشہور شخصیت خواجہ حسن نظامی کے خطوط بھی موجود ہیں۔ ایک خط جو خواجہ صاحب نے ۱۲۔ مئی ۱۹۲۷ء کو دہلی سے ان کے نام تحریر کیا تھا، چند الفاظ پر مشتمل ہے اور حسب ذیل ہے۔

از حسن نظامی!

بخدمت حامیٔ اسلام میاں عبدالعزیز صاحب

السلام علیکم!

زندہ باد عبدالعزیز، لاہور کے مسلمانوں کو مصیبت میں سہارا دینے والے۔ سارا ہندوستان آپ کا ممنون ہے۔

دعاگو

حسن نظامی

پرائیویٹ

خطوط کے اس وسیع ترین ذخیرے میں قائداعظم محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


علامہ اقبال، گاندھی جی، نواب زادہ لیاقت علی خاں، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی، حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ماسٹر تارا سنگھ، میاں احمد یار خاں دولتانہ، سر شاہ نواز خاں آف ممدوٹ، سر فضل حسین، سردار سکندر حیات خاں، ملک فیروز خاں نون، چوہدری افضل حق، مولانا ظفر علی خاں، مظہر علی اظہر، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا احمد علی، مولانا علام مرشد وغیرہ بے شمار حضرات کے خطوط موجود ہیں۔

ان خطوط میں علامہ اقبال کا ایک ایسا خط بھی میں نے دیکھا ہے، جس میں چند شعر لکھے ہیں اور تحریر کیا ہے کہ یہ شعر ابھی ہوئے ہیں۔

اگست ۱۹۸۴ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے لاہور سمٹ مینار کی عمارت میں میاں صاحب کے نام کے بعض خطوط اور ان کی اہم دستاویزات کی نمائش کی گئی تھی۔

اسی طرح غالباً وہ دُنیا کے واحد شخص تھے جو نہ حکومت کے کسی منصب پر فائز تھے، نہ وزیر تھے، نہ افسر تھے، نہ صاحبِ اقتدار تھے، مگر اس قدر کثیر تعداد میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی وغیرہ ان کے گھر آتے تھے کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ دو بادشاہ بھی یکے بعد دیگرے ان کے مکان پر آئے، ایک والیٔ افغانستان امان اللہ خاں اور دوسرے اسی ملک کے حکمران نادر شاہ۔ ! مہتر آف چترال بھی ان کے مہمان رہے۔

علمائے دین کے اجلاس بھی ان کے مکان پر ہوتے رہے، ان اجلاس کے شرکائے کرام میں حنفی، اہلِ حدیث اور شیعہ تینوں مسالکِ فقہی سے تعلق رکھنے والے حضرات شامل تھے۔ مثلاً مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا سید حسین احمد مدنی، پیر صاحب مانکی شریف، مرزا احمد علی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا عبد القادر قصوری، مولانا احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ وغیرہ ــ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو مختلف مسالکِ فقہی سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام کی موجودگی میں ان کے مکان پر "امیرِ شریعت" کا پُر افتخار لقب عطا کیا گیا تھا۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ مولانا انور شاہ کی تجویز سے یہ خطاب مولانا احمد علی صاحب کی مسجد واقع شیرانوالہ گیٹ میں دیا گیا تھا۔ ممکن ہے دونوں مقامات پر اس معاملے میں گفتگو ہوئی ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


بلاشبہ میاں عبدالعزیز اپنے دور کی عظیم اور منفرد شخصیت تھے، جن کے تعلقات و مراسم کا دائرہ انتہائی وسیع تھا۔ خدا جانے ان میں کیا خصوصیت تھی کہ جس کو کسی قسم کی کوئی مشکل پیش آتی اور جو کسی اہم مسئلے سے دوچار ہوتا، ان کے دروازے پر آ دستک دیتا تھا۔ ماسٹر تارا سنگھ کو ہم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہوں گے، وہ مسلمانوں کے خلاف نہایت تعصب و کدورت رکھتا تھا اور اس کا برملا اظہار کرتا تھا، لیکن میاں عبدالعزیز کے سامنے نہایت ادب سے گردن جھکا کر اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوجاتا تھا اور انھیں "گروجی" کہا کرتا تھا۔

میاں صاحب بڑے رحم دل، نرم خو اور نیک سیرت تھے۔ وہ اپنے ملازموں کے لیے بھی بڑے ہمدرد تھے اور ان کے بچّوں سے بھی بے حد پیار کا اظہار کرتے تھے۔ سخت غصّے کی حالت میں بھی ان کے الفاظ یہ تھے — "او بھلے مانسو" — وہ کسی کو گالی نہ دیتے تھے، نہ کوئی ایسا لفظ زبان سے نکالتے تھے جس سے کسی کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔

وہ لاہور کی اس قدر معزز شخصیت تھے کہ لاہور میونسپل کمیٹی کے بھی رکن یا صدر رہے اور لاہور کارپوریشن کے بھی ممبر اور چیئرمین منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ لاہور کارپوریشن کے چیئرمین تھے۔ وہ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کے ممبر بھی رہے۔

انھوں نے کارپوریشن کے چیئرمین اور امپرومنٹ ٹرسٹ کے ممبر کی حیثیت سے لاہور کے شہریوں کی بہت خدمت کی اور سڑکوں اور نالیوں کی صفائی، بجلی کے انتظامات اور پینے کے پانی کی فراہمی وغیرہ کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول رکھی۔ انھوں نے بھرپور زندگی بسر کی اور عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

- سیاست میں حصّہ لیا تو بے داغ رہے۔
- وکالت کی تو نام پیدا کیا اور ہر اعتبار سے کامیاب رہے۔
- کوئی انجمن قائم کی تو اس میں عوام کی خیرخواہی پیش نظر رہی۔
- کسی سوسائٹی میں گئے تو ملک و قوم کی بہتری کے لیے کام کیا۔
- ارائیں برادری میں بے شمار اصلاحی کام کیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



- علمائے کرام میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔
- سیاست دانوں میں معزز قرار پائے۔
- عوام و خواص میں محترم گردانے گئے۔
- لاہور میں ڈیوس روڈ، ایمپرس روڈ اور ایبٹ روڈ کے چوراہے پر جو سیرگاہ "شملہ پہاڑی" کے نام سے معروف ہے، یہ اس زمانے میں بنائی گئی تھی، جب میاں صاحب لاہور میونسپل کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے۔ یہ لاہور کی اصل آبادی سے کچھ فاصلے پر "آوا" تھا، میاں صاحب کی تجویز اور کوشش سے اسے پہاڑی کی شکل دی گئی اور یہ ایک بہترین اور خوب صورت سیرگاہ بن گئی۔

مزنگ میں کوئین روڈ پر جو پہاڑی ہے اسے بھی پہلے آوے کی حیثیت حاصل تھی، میاں عبدالعزیز کی تجویز و کوشش سے اس کو بھی پہاڑی کی شکل دی گئی۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ میاں صاحب بڑے خوش مزاج تھے۔ ایک دن حاجی محمد اسحاق حنیف اور ان سطور کا راقم ان کی خدمت میں حاضر تھے، اور بھی چند آدمی بیٹھے تھے کہ کسی نے ان سے پوچھا:

سوشلسٹ کون ہوتا ہے۔؟

مسکراتے ہوئے جواب دیا: سوشل آدمی۔

ان کا حافظہ بہت عمدہ تھا اور یادداشت بڑی اچھی تھی۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، مگر اپنی لائبریری کی کتابوں کی ترتیب پوری طرح ذہن میں محفوظ تھی۔ اُنھیں معلوم تھا کہ کون سی کتاب کہاں ہے اور کس الماری میں ہے۔ کون سی بات کس کتاب میں ہے اور کون سے صفحے پر ہے۔ ان کی لائبریری بہت سی کتابوں پر مشتمل تھی جو آج تک موجود ہے۔

اُنھوں نے ۱۹۴۶ء تک وکالت کی، پھر ضعفِ بصارت کی وجہ سے خود تو وکالت نہیں کرتے تھے، البتہ بہت سے وکلا حضرات قانونی مشوروں کے لیے آتے تھے اور اُنھیں کھلے دل سے مشورے دیتے تھے۔

۱۹۵۱ء میں ایک ماہر چشم ڈاکٹر سے دائیں آنکھ کا اپریشن کرایا، مگر اپریشن کامیاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


ہونے کی بجائے خراب ہوگیا اور نظر بالکل بند ہوگئی۔

یہاں یہ واقعہ بھی سنتے جائیے کہ اپریشن سے پہلے وہ حقہ اور سگریٹ پیا کرتے تھے۔ جب آپریشن کے لیے میو ہسپتال میں داخل ہوئے اور آپریشن تھیٹر کی طرف لے جائے گئے تو اس وقت ان کے ہاتھ میں سگریٹ تھا جو ابھی سلگایا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا آپ کو چند روز کے لیے سگریٹ چھوڑنا پڑے گا، سگریٹ نوشی آپریشن کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ میاں صاحب نے اسی وقت سگریٹ پھینک دیا اور پھر کبھی نہیں پیا۔ ڈاکٹر نے کئی دفعہ کہا کہ آپ طویل عرصے تک سگریٹ پیتے رہے ہیں، اب آنکھ تو ختم ہو گئی ہے، سگریٹ چھوڑنے سے آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی، اس لیے سگریٹ پی لیا کریں، لیکن اُنھوں نے نہیں پیا۔

بینائی ختم ہو جانے پر اُنھوں نے کبھی کسی قسم کے افسوس یا ملال کا اظہار نہیں کیا، اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ فرمایا کرتے تھے اللہ کی مرضی یہی تھی۔ اس نے دنیا میں بڑی عزت دی، بہت دنیا دیکھی۔ اب باقی زندگی اللہ کے شکر میں گزار رہا ہوں اور اس کی رضا پر خوش ہوں۔

البتہ اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ آنکھوں کا کوئی مشہور ڈاکٹر یہاں آیا ہے تو اس سے ضرور ملتے اور مشورہ لیتے تھے۔ بلکہ اپنی ہسٹری شیٹ بھی یورپ کے ایک ماہر امراضِ چشم ڈاکٹر کو لکھ کر بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ اگر علاج کی صورت ہو سکتی ہے تو وہاں جا کر علاج کرایا جائے، لیکن جواب نفی میں آیا۔

بینائی ختم ہو جانے کے بعد اُنھوں نے ایک مستقل ملازم محض اخبارات اور مذہبی و سیاسی نوعیت کی کتابیں سنانے کے لیے رکھا تھا۔ وفات سے ایک دن پہلے تک اخبارات سننے اور ایسے تراشے محفوظ رکھنے اور نوٹس لینے کا معمول جاری رہا جو ان کے نزدیک ضروری تھے۔ ملکی و غیر ملکی حالات سے باخبر رہنے کے لیے وہ ریڈیو باقاعدہ سنتے تھے۔

میں نے ان کو پہلی مرتبہ جنوری ۱۹۴۹ء میں دیکھا تھا۔ دبلے پتلے، میانہ قد، گندمی رنگ، چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی، شلوار قمیض اور گرم کوٹ پہنے ہوئے۔ وہ اپنے مکان واقع سرکلر روڈ (بیرون یکی دروازہ) میں کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت وہ لاہور کارپوریشن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


کے میئر تھے۔

یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد کئی دفعہ ان سے ملنے اور باتیں کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اکیلا بھی ان سے ملا اور مولانا سید داؤد غزنوی کے ساتھ بھی ان کی خدمت میں گیا۔ ان کا اسلوب کلام نہایت دھیما اور لہجہ انتہائی میٹھا تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا وہ برصغیر کے بہت بڑے قانون دان تھے۔ ان کے دورِ وکالت کی بہت سی اہم قانونی دستاویزات ان کے گھر میں موجود ہیں۔ مثلاً:

- غازی علم الدین شہید کے مقدمے کی فائل۔
- مسجد شہید گنج کے مقدمے کی فائل۔
- سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ۱۹۴۰ء کے اس مقدمے کی فائل، جس میں سرکاری رپورٹر لدھارام کو شاہ جی کے خلاف گواہی نہ دینے کے سلسلے میں منحرف گواہ قرار دے دیا گیا تھا اور اس کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے گئے تھے۔
- آزاد ہند فوج کے مقدمے کی فائل۔

اس کے علاوہ اور بھی متعدد اہم دستاویزات اور فائلیں ان کے کاغذات کے وسیع ذخیرے میں موجود ہیں، جن کا تعلق قانونی اور سیاسی معاملات سے ہے، ان کی مدد سے دورِ گزشتہ کے برصغیر کی اچھی خاصی سیاسی تاریخ معرضِ تحریر میں آسکتی ہے۔ یہ تاریخ بے حد معلومات افزا اور دلچسپ ہوگی۔

وہ طویل عرصے سے وکالت کا سلسلہ ترک کر چکے تھے، لیکن سوچ کا انداز آخر تک قانونی نوعیت کا رہا۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ ہمارے ایک معزز دوست حاجی محمد اسحاق حنیف جو مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے ناظم نشر و اشاعت تھے، اپنی گاڑی میں جسے وہ خود ہی چلا رہے تھے، صبح کے وقت لارنس روڈ پر مردہ پائے گئے۔ ان کی نعش ڈرائیور سیٹ پر تھی۔ وفات سے دوسرے دن میاں عبدالعزیز کے مکان پر جماعت اہلِ حدیث کے بعض ارکان کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ کا اہتمام میاں عبدالعزیز کے فرزندِ گرامی میاں عبدالمجید مرحوم نے کیا تھا جو اس وقت مرکزی جمعیت کے ناظم مالیات تھے۔ میاں عبدالعزیز بھی اس میٹنگ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تشریف فرما تھے اور خاموش بیٹھے لوگوں کی باتیں سُن رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کوئی بات کی تو بولے:

جس گاڑی میں حاجی صاحب مردہ پائے گئے، اس گاڑی کی چھت پر کوئی گرد و غبار بھی تھی؟

ایک شخص نے جواب دیا: گرد و غبار تھی۔

پھر پوچھا: اس پر انگلیوں کے نشان تھے؟

کہا: انگلیوں کے نشان تھے۔

پوچھا: پولیس نے اس پر توجہ کی یا کسی نے پولیس کو توجہ دلائی؟

جواب دیا: معلوم نہیں۔

میاں صاحب نے اس کے بعد سوال کیا: جائے واردات پر کوئی جوتا یا کپڑا وغیرہ بھی تھا؟

کہا: پُرانا سا جوتا پڑا تھا، جسے "چھتر" کہا جاتا ہے۔

پوچھا: وہ چھتر پولیس نے قبضے میں کیا؟

جواب دیا: نہیں۔

بولے: قتل اس جوتے میں تھا، جسے آپ "چھتر" کہہ رہے ہیں۔ اس شان دار سڑک پر چھتر کہاں سے آیا؟

پھر تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا: پولیس نے گاڑی کی چھت پر سے انگلیوں کے نشان بھی نہیں لیے۔ یہ پولیس کی غلطی ہے۔ چھتر بھی اس نے قبضے میں نہیں کیا۔ قاتل کا پتا نہیں چل سکے گا ——— چنانچہ اس حادثے پر تیئیس ۲۳ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن قتل کا پتا نہیں چل سکا۔

میاں محمود علی قصوری کو ایک مرتبہ گرفتار کر کے جیل میں بھیج دیا گیا تھا، میاں عبدالعزیز کو پتا چلا تو وہ وکیلانہ لباس پہن کر میاں صاحب کے دفاع کے لیے ہائی کورٹ پہنچ گئے۔ اس وقت وہ نابینا ہو چکے تھے اور کمزوری اور کبر سنی کی بنا پر صحت بھی کمزور تھی، ہائی کورٹ کے جج صاحبان اور وکلا حضرات کو پتا چلا تو انھوں نے ان کی شان کے مطابق ان کا استقبال کیا اور نہایت احترام سے پیش آئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



میاں عبدالعزیز مالواڈہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ بڑے نیک اور صاحبِ دل بزرگ تھے اور اس سلسلے میں اپنے آبا واجداد کی روایات کے امین تھے۔ مصری شاہ کا عزیز روڈ انھی کے نام سے موسوم ہے، وہاں انھوں نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جو مسجد عزیز کے نام سے مشہور ہے اور لاہور کی قدیم مساجد اہلِ حدیث میں شمار ہوتی ہے۔ تقریباً تیس سال سے اس کے خطیب ہمارے دوست مولانا محمد سلیمان انصاری ہیں جو ہفت روزہ "الاعتصام" کے مدیر انتظامی ہیں۔

میاں عبدالعزیز کا آبائی مکان جو سرکلر روڈ پر بکّی دروازے کے باہر تھا، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا کسی زمانے میں برصغیر کے مشاہیر و اکابر کا مرکز تھا۔ اب کئی سال سے اس کے مکین یہاں کی سکونت ترک کر کے چھاؤنی کے علاقے (اسد جان روڈ) میں منتقل ہو چکے ہیں اور اسے منہدم کر کے "مالواڈہ کمپلیکس" میں بدل دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس کی تاریخی حیثیت ختم کر دی گئی ہے اور جن مقامات کو دورِ گزشتہ کے ہندوستان کی ممتاز شخصیتوں کی آماجگاہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا، اب وہ کاروباری مرکزوں اور دکانوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں

انقلابات ہیں زمانے کے

میاں عبدالعزیز نے بڑی پُر رونق اور ہنگامہ خیز زندگی بسر کی۔ انھوں نے ننانوے برس (۹۹) یعنی ایک کم سو سال عمر پا کر ۲۸ جولائی ۱۹۷۱ء کو صبح نو بجے اس دنیائے فانی سے منہ موڑا اور عالمِ آخرت کی راہ لی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

انھیں اُن کے آبائی قبرستان الٰہی بخش پارک (مصری شاہ) میں دفن کیا گیا۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

---

© rasailojaraid.com